ہ بجام دل کشد بادۂ دلکشا را ئے
بر سر سنگ میزند جام جہاں نما را ئے

دُرِّ دانی

یعنی

چند چیدہ مضامین کا مجموعہ جو دائرۃ الادب میں پڑھے گئے

مرتبہٗ

نوابزادہ مرتضیٰ علی خاں صاحب فونڈر و سکریٹری دائرۃ الادب بمبئی

Nawabzada Murtaza Ali Khan.

FOREWORD.

The " Dairat-ul-Adab " established a little over four yea[rs]
ago, owes its existence to the initiative of Nawabzada Murtaza A[li]
Khan. Though it has no great achievement to its credit, it ha[s]
justified its existence by stimulatiug interest in cultural pursui[ts]
and by bringing together some men devoted to such pursuits.

In a city like Bombay the need for such an institution is a[s]
great as the field for fruitful work by it is vast; and it is a pity th[at]
the membership is not as large as it should be. True Cultur[e]
knows neither creed ncr caste. Dairat-ul-Adab, therefore, can b[e]
a most powerful instrument for promoting inter--communal har-
mony which can be disturbed with greater difficulty the mor[e]
true culture spreads among all Communities. All lovers of th[e]
country must therefore wish growing success to institutions lik[e]
the Dairat--ul--Adab.

Syed ABDULLAH Brelvi
Editor " The Bombay Chronicle. "

INTRODUCTION.

" Dairat--ul--Adab" (The Literary Circle Bombay) wa[s]
founded by me with the help of some friends in 1931, when it[s]
inaugural meeting was held on Dec. 13th 1931. at my place an[d]
was presided over by that literary luminary of the Panjab th[e]
Hon'ble Justice Sir Abdul Qadir, now a member of the Counc[il]
of the Secretary of State for India.

The aim and object of the Dairat--ul--Adab is the fosterin[g]
and developing of literary culture, and infusing and creating [a]
true literary taste in the people of the City and Presidency o[f]
Bombay by means of literary Monthly meetings, Conversazione[s]
and the pubiication of a Literary Journal.

We celebrated its First Anniversary by giving a Dinner at the adio Club Bombay, on the 11th February 1933, which was pre-ded over by that highly cultured gentleman the late lamented e Hon'ble Mr. Justice Mirza Ali Akbar Khan of Bombay, hen most of the elites of the city were present and telegrames onveying good wishes were received among others, from Sir bdul Qadir & Nawabzada Abdul Ali, the Imperial Record Keeper the Government of India.

Unfortunately due to my long illness and absence from ombay for several months and various other causes, meetings ould not be held regularly in 1934 & 1935; but arrangements ave now been made to hold meetings regularly.

It is indeed a pity that its membership has not increased to ny appreciable extent so far, and in order to give it more publi-ty and as a token of the celebration of its Fifth Anniversary, have brought out this " Brochure " of three selected Urdu apers, and in presenting it to the public I fervently appeal to e cultured men and women of Bombay, withought any distinc-on of caste and creed to join the Dairat--ul--Adab in large num-ers, and make it a living emblem of all that it stands for.

In conclusion I would like to make it abandantly clear that s activities are not confined to Urdu alone, but a member has very right to read his paper in any other language that he or e preferred, taking into account, of course, that the majority o embers understood it and provided that it made a real contri-ution to the Country's literature and Culture.

Syed MURTAZA ALI KHAN,
Founder & the Hony. Secretary.

فہرست مضامین

اُردو شاعری پر ایک سرسری نظر

اُردو کے ماخذ میں اختلاف ہے۔ آزاد کے نزدیک اس زبان کا ماخذ برج بھاشہ ہے۔ مسٹر سکینہ اُردو کا گھوارہ اس دیسی زبان کو بتاتے ہیں جو عام طور پر دلّی اور اسکے اکناف میں بولی جاتی تھی۔ پرفیسر ندوی کی تحقیق کے مطابق اُردو گجراتی سے نکلی ہے۔ راز عظیم آبادی اس کا ماخذ پالی زبان کو ٹھیراتے ہیں۔ بہرحال اصلیت جو کچھ بھی ہو اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس کا ماخذ ہندوستان کی وہی کوئی پراکرت ہوگی جو اس زمانہ میں بکثرت مروّج تھی اور اقصائے دکھن و گجرات تک پھیلی ہوئی تھی۔ اور چونکہ برج بھاشہ ہی کو یہ ہمہ گیر امتیاز ایک حد تک حاصل تھا اس لئے میری ناقص رائے میں اُردو کا ماخذ اصولاً برج بھاشہ ہی ہونا چاہیئے۔ وہو العلیم۔

دوسری اور زبانوں کی طرح اُردو کی تاریخ بھی نظم ہی سے شروع ہوتی ہے ایک عرصہ تک لوگوں کا یہ خیال تھا کہ ولی دکھنی اُردو کا پہلا شاعر ہے مگر نہیں تحقیق نے اب اسکو ثابت کردیا ہے کہ ولی سے تقریباً سوا سو سال پیشتر اردو شاعری (ریختہ) دکھن میں جنم لے چکی تھی اور اس کا تاج قطب شاہی بادشاہوں کے زیب فرق ہے چنانچہ محمد قلی قطب شاہ متوفّی ۱۰۲۳ھ

محمد قلی قطب شاہ کی شاعری کا نمونہ جو غالباً اردو کلام کا قدیم ترین نمونہ ہے ملاحظہ ہو:۔

پیاہوں حضرت کے ہمت آب کوثر
تو شاہاں اُپر مجھ کلس کر بنایا

اُس زمانہ کی نظم کا دائرہ حمد و نعت و مرثیہ تک محدود تھا۔ بہرحال ولی ہوں یا محمد قلی اس میں اب قطعی انکار کی گنجایش نہیں کہ اردو شاعری یعنی اردو زبان نے سب سے پہلے دکھن ہی میں جنم لیا۔ ولی نے اس ننھے معصوم کو پالا۔ سنبھالا۔ گود میں لئے دِلی پہنچے ۱۱۳۴ھ (محمد شاہی عہد) کی دِلی کچھ اور دِلی تھی۔ شاہ حاتم قزلباش خاں اُمید شاہ سعداللہ گلشن۔ شاہ مبارک آبرو وغیرہ وغیرہ نے اس بچے کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ کنارِ عاطفت میں بڑی جتن سے جگہ دی پال پوس کر میر درد۔ میر تقی۔ مرزا رفیع السودا جیسے اُستادوں کے ہاتھ میں اس کا ہاتھ دے کے چل بسے ان بزرگواروں نے اس نونہال کی ایسی پرورش کی کہ رعنائے چمن بنا چھوڑا۔ آج بھی جب اِن متقدمین کے کلام دیکھتا ہوں طبیعت میں کیف پیدا ہوتا ہے۔ زبان چٹخارے لیتی ہے۔ شاعری کے بہترین زیور۔ جذبات و سلاست سے مملو پاتا ہوں۔ دل مست ہو جاتا ہے۔ مثلاً شاہ مبارک آبرو کا یہ شعر:۔

نین سے نین جب ملائے گیا
دل کے اندر مرے سمائے گیا

آبرو

سادگیٔ زبان۔ سلاستِ محاورہ۔ اظہارِ جذبات میں آج بھی یکتا ہے
ولیؔ کو لیجئے:۔

ولیؔ
اک دل نہیں آرزو سے خالی
ہر جا ہے محال اگر خلاء ہے

ایک عالمگیر جذبہ ایک حقیقی واقعہ کو کچھ ایسی بے ساختگی سے فلسفیک کلیہ کے ماتحت نظم کر گیا ہے کہ عقل حیران رہجاتی ہے۔ یا یہ شعر:۔

گر ہوا ہے طالبِ آزادگی
بند مت ہو سبحہ و زنّار کا

آج کون ہے جو اس مضمون کو ایسے خوبصورت الفاظ اور سادگی بندش سے ادا کر سکے اگر یہ بتایا جائے کہ ولیؔ کا شعر ہے تو کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ آج سے دو سو برس قبل کی زبان ہے۔ سچ ہے

ع زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے!

حاتمؔ
یا شاہ حاتمؔ کا یہ شعر:۔

کہیں ہیں اہلِ عرفاں اسکو جینا
جو مر کر عشق میں دنیا سوں ہارا

حافظؔ کے اس شعر:۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

کا ترجمہ ضرور کہا جائیگا مگر پھر بھی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

مظہر

یا مرزا جانِ جاناں مظہرؔ کی یہ غزل :-

چلی اب گُل کے ہاتھوں سے لُٹا کر کارواں اپنا
نہ چھوڑا ہائے بُلبل نے چمن میں کچھ نشاں اپنا

مضمون آرائی بندش خیال۔ نزاکتِ محاورہ و سلاستِ زبان کے لحاظ سے قیامت تک زندہ رہیگی۔ خصوصًا دوسرا شعر :-

یہ حسرت رہگئی کیا کیا مزے سے زندگی کرتے
اگر ہوتا چمن اپنا گُل اپنا باغباں اپنا

اُف! کون ہے جس کا سینہ اپنے پہلو میں دل رکھتا ہو اور اُس دل میں یہ جذبہ نہ ہو؟ عالمِ بے بسی و آرزو یعنی یاس و آس کی ایک ایسی جانگسل تصویر کھینچی ہے کہ تعریف نہیں ہو سکتی۔

سودا

سودا نے اپنے لئے نئے آسمان بنائے۔ بندشِ خیال عروجِ مضامین شوکتِ الفاظ و اظہارِ جذبات کے بادشاہ ہونے فرماتے ہیں :-

دل عشق کے شعلہ سے جو بھڑکا تو رہا کیا؟
اے جانِ نکل جا کہ لگی متصل آتش

سُبحان اللہ! یہ شعر اپنے پہلو میں جذبات کا ایک کوہِ آتش فشاں لئے ہوئے ہے

میر

میر تقی میر اردو شاعری کے ابُو الآباء کہے جاتے ہیں اور یہ سچ ہے۔ اُنہوں نے اُردو زبان میں ایک ایسی سلاست پیدا کر دی کہ جس کی تقلید آج تک فصاحت کا آل تمغہ سمجھی جاتی ہے

دیکھئے کلام میں کس بلا کی سادگی ہے :۔

اُسکے ایفائے عہد تک نہ جئے
عمر نے ہم سے بے وفائی کی

کس کا منہ ہے کہ تعریف کرے ! یا :۔

آنکھوں ہی میں رہے ہو دل سے نہیں گئے ہو
حیران ہوں یہ شوخی تمہیں آئی کہاں سے

اللہ ! اللہ ! کیا لوگ تھے کیا طبیعتیں تھیں کہ روز مرہ میں شاعری کی ایک دنیا اور جذبات کا ایک عالم دکھا گئے بہر کیف عالمگیر سے محمد شاہ اور شاہ عالم تک زبان نے بہتیرے رنگ بدلے ثقیل علوی اور بھونڈے الفاظ متروک ہوتے گئے۔ نئی بول چال نئی چلن سے رائج ہوئی۔ لیکن جن ناگہانی آفتوں نے اردو شاعری کے ارتقاء و عروج کو سخت ترین صدمے پہنچائے وہ ملکی حوادث اور قومی مصائب ہیں جنکا خیالات پر کچھ ایسا شدید اثر پڑا کہ مضامین کی بلند پروازیاں آہ و نالے سے بدل گئیں۔ حکیم مومن خان نے اس پر آشوب زمانہ کی کیفیت ایک رباعی میں اس طرح دکھائی ہے :۔

ہر صبح غموں میں شام کی ہے ہم نے
خوں نابہ کشی مدام کی ہے ہم نے
یہ مہلت کہ جس کو کہتے ہیں عمر
رو رو کے غرض تمام کی ہے ہم نے

بہر حال دِلّی بگڑی لکھنؤ آباد ہوا۔ آفتاب (شاہ عالم کا تخلص) میں گھن لگ چکا تھا۔ آصفُ الدولہ کی فیاضیوں نے شاہ عالم کے دربار اور دِلّی کی سرزمیں کو آہستہ آہستہ شعراء سے خالی کرا چھوڑا۔ مرزا رفیع السودا۔ میر تقی میر۔ انشاء اللہ خاں انشاء وغیرہ وغیرہ کھنچ کھنچکر لکھنؤ جا براجے۔ اور اس نئے شہر کے دربار و بازار کو اپنی گرمی کلام سے تڑپھانے لگے۔ لیکن افسوس وہاں کی آب و ہوا اردو شاعری کے تئیں راس نہ آئی۔ اوّل اوّل تو ان بزرگواروں نے دلی کی روشنِ خیال آفرینی اور سخن سنجی کی طرح ڈالی مگر جب اس جنس کے خریدار اُٹھ گئے تو طلب زمانہ کے موافق یا مجبوریوں سے مجبور ہو کر وہاں ہی کی روش اختیار کر بیٹھے یا خانہ نشیں ہو گئے۔ غضب خدا! آصفُ الدولہ بید کی چھڑی سے حوض کا پانی اُچھالتے جاتے ہیں اور میر تقی میر سے شعر کی فرمائش کرتے جاتے ہیں۔ جب میر صاحب چیں بہ جبیں ہو کر فرماتے ہیں قبلۂ عالم! حضت تو پانی سے شغل فرما رہے ہیں میں شعر کیسے سُناؤں تو جواب مِلتا ہے میر صاحب! جو شعر ہوگا خود ہی متوجہ کر لے گا۔ بات ضرور لگتی ہوئی تھی۔ مگر میر صاحب کی شاعری کی شان میں ایسا کہنا انتہائے نا قدر دانی اور نا سخن فہمی کی دلیل تھی۔ میر صاحب نے اُسی دِن سے گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ دربار کا جانا چھوڑ بیٹھے۔ اسی سے سمجھ لینا چاہیئے کہ جہاں کے فرماں روا کی قدر شناسی اور سخن سنجی کا یہ عالم ہو وہاں زبان کیا خاک بنے و پنپے۔ نواب سعادت علیخاں کے

زمانہ میں اُردو شاعری نے لکھنؤ میں جو رنگ پکڑا وہ انشاءاللہ خاں انشاؔء کے کلام و کوائف سے اظہر من الشمس ہوتا ہے۔ مگر پھر بھی جب یہ یکتائے روزگار شخص دربار کے ہرزہ سرائی پسند ماحول سے دور رہکر کچھ کہتا تھا تو ایسا کہتا تھا کہ آج تک جواب نہیں ملتا۔ جرأت کے مندرجہ ذیل شعر کی مناسبت پر انشاء نے جو کہا ہے ملاحظہ ہو:۔

جرأت ۔ اب تلک آنکھوں میں ساقی ہی نشہ چھایا ہُوا
چنپئی رنگ اس کا اور جوبن وہ گدرایا ہُوا

انشاء:۔

انشاء ۔ برق چشمک زن ہے ساقی اَبر ہے چھایا ہُوا
جام مئے دے تو کدھر جاتا ہے مچلایا ہُوا

آسمان و زمین کا فرق ہے۔ یا یہ غزل:۔

لگا کے برف میں ساقی صراحیِ مئے لا
جگر کی آگ بُجھے جلد جس سے وہ شئے لا

یہ صرف پانچ شعر کی غزل تھی۔ آزاد آبحیات میں لکھتے ہیں کہ جس مشاعرہ میں انشاء نے یہ غزل طرح کی پڑھی تھی۔ مصحفی تک نے اپنی غزل ہاتھ سے رکھدی تھی۔ دوسروں کو کون پوچھے۔

یا:۔ کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں
بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

ایک ایسا مرصع کلام ہے کہ لوازمۂ توصیف سے بالا ہے کسی نے کہا ہی کیا

انشاء کے فضل و کمال کو شاعری نے کھویا اور شاعری کو سعادت علیخاں کی مصاحبت نے ڈبویا۔ میں تو یوں کہونگا کہ انشاء کے فضل و کمال کو سعادت علیخاں نے تباہ کیا اور شاعری کو لکھنؤ نے ڈبویا۔ بہرحال اس میں کلام نہیں کہ اردو شاعری میں غلط روی کا آغاز لکھنؤ ہی سے شروع ہوتا ہے۔ رہی سہی جو کچھ بات بھی باقی تھی اُسے ناسخ نے خاک میں ملا دیا۔ واضح رہے کہ یہ صاحب پنجاب کے رہنے والے تھے اور اُردو سے انہیں وطنی مناسبت نہ تھی۔ چنانچہ اسی بنا پر میر تقی میر نے انہیں شاگرد بنانے سے انکار کر دیا تھا۔ بے اُستاد رہ کر ناسخ کلامِ اوّلیں بن بیٹھے۔ اور شاعری کو الفاظ کا ایک گورکھ دھندا بنا چھوڑا۔ عروجِ تخیل۔ خیال آفرینی و جذبات کی جگہ دور از کار تشبیہوں اور استعاروں کے کانٹے بچھا کر غریب شاعری کو اس میں بے طرح گھسیٹتے رہے فرماتے ہیں:-

ناسخ

کیا نگس بیٹھے بھلا اس شعلہ رو کے سامنے

اپنے داغوں سے جلا دیتے ہیں پروانہ کو ہم

مشتے نمونہ از خروارے ہے۔ مگر اسی سے پتہ چل جاتا ہے۔ بقولے مکھی اُڑا نے کا نام شاعری اور خیال آفرینی نہیں ہے۔ یہی حضرت لکھنؤ اسکول کے بانی کہے جاتے ہیں۔ ان کی تقلید کی وبا ایسی پھیلی کہ آجتک اُردو شاعری سے اس کی گندگی دفع نہیں ہوئی ہے۔ مگر جسے اللہ رکھے اُسے کون چکھے انہی کے زمانہ میں ایسے بھی لوگ پیدا ہو گئے جنہوں نے اصلی شاعری کو

قطعی برباد و تباہ ہو جانے سے بچا لیا۔

غالب دِلّی میں غالبؔ و ذوقؔ وغیرہ۔ لکھنؤ میں آتشؔ و میر حسنؔ وغیرہ۔ غالبؔ نے اردو شاعری میں اتفاقیہ قدم ڈالا۔ اگلوں سے الگ معنی آفرینی کے ایک نئی طرز کے موجد ہوئے اور ایسے ہوئے کہ جہاں سلامت روی کو کام میں لاتے ہیں۔ اردو شاعری کو ایسی بلندی پر لیجاتے ہیں کہ نظر پہنچتے ہوئے خیرہ ہوتی ہے۔ فلسفیانہ خیال کو بعض موقعوں پر اس حُسن سے بیان کر جاتے ہیں کہ پڑھکر کیف طاری ہو جاتا ہے۔ مثلاً :-

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حُسن نہ ہوتا خود بیں

— سُبحان اللہ وحدت الوجود کا فلسفہ اور تغزل کا یہ رنگ لئے ہوئے انہی کا کام تھا یا :-

سب کہاں کچھ لالہ و گُل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہونگی کہ پنہاں ہو گئیں

جب تغزل پر آتے ہیں تو تشبیہوں کا چمن یوں کھلاتے ہیں :-

نیند اسکی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اسکی ہیں
تیری زلفیں جسکے شانوں پر پریشاں ہو گئیں

صنعتِ مبالغہ کو اس طرح برتتے ہیں :-

دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک
میرا سر دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

ہیومن سائی کولوجی کو اس طرح قالب شعر میں لاتے ہیں :-

اُن کے دیکھے سے جو آجاتی ہی رونق مُنہ پر
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

ذوق نے مضمون آرائی و شوکت الفاظ میں کمال حاصل کیا۔ بلا کے قادر الکلام تھے۔ قصیدوں کے بادشاہ ہوئے

ذوق

۱۹ برس کے سن میں اکبر شاہ ثانی سے خاقانی ہند کا خطاب پایا زبان نہایت پاکیزہ رُفتہ اور شُستہ محاورے باندھتے تھے۔ کیا خوب فرماتے ہیں :-

بنایا آدمی کو ذوق ایک جزو ضعیف
اور اِس ضعیف سے کُل کام دو جہاں کے لئے

قصاید میں اکثر ڈسکرپٹو شاعری کا پہلو عیاں باندھتے تھے۔ صُبح کی کیفیت میں فرماتے ہیں :-

دی ہی مسجد میں موذن نے اذان بہر نماز
باوضو ہو کے نمازی نے ہے باندھی نیت
اُٹھی ہے خوار صبوحی کے لئے لیکے صبو
کہ عداوت ہے اگر کیجئے ترک عادت
لے کے انگڑائی کبھی سینے لگی رام کلی،
اٹھی ملتی ہوئی آنکھوں کو کبھی اپنی للت
چشم سرمست مئے ناز میں کاجل پھیلا
لب میگوں پہ مسی کی ٹہری پھیکی رنگت

غضب کا شعر ہوا ہے۔

آتش

لکھنؤ میں آتش نے اپنے اُستاد مصحفی کے رنگ کو
خوب چمکایا اور ناسخی وبا سے ایک جماعت کو بچالیا۔
ان کا کلام مقبولیت عام کا طُرّہ اب تک زیب دستار کئے ہوئے ہے۔
سلاست زبان اور حُسن بیان ملاحظہ ہو۔ فرماتے ہیں:-

لگے مُنہ بھی چڑھانے دیتے دیتے گالیاں صاحب
زباں بگڑی تو بگڑی تھی خبر لیجے دہن بگڑا
بناوٹ کیفِ مے سے کھل گئی اس شوخ کی آتش
لگا کر مُنہ سے پیمانہ کو وہ پیماں شکن بگڑا

دلی کے محاورے کس خوبصورتی سے نظم کر جاتے ہیں۔ کلام کا بے ساختہ پن
تو دیکھئے:-

خانہ خراب نالوں کی بل بے شرارتیں
بہتی ہیں پانی ہو ہو کے سنگیں عمارتیں

میر حسن

میر حسن نے مثنوی لکھکر دنیا سے خراجِ تحسین حاصل
کیا۔ اسکی سلاست زبان ترکیب محاورہ۔ بندش الفاظ۔
حُسن بیان کو بیان کرنے بیٹھوں تو دفتر چاہیئے۔ ایک عطر تھا کہ جسکی خوشبو
آج سو برس سے ہر ادنیٰ و اعلیٰ کے دماغ کو معطر کئے ہوئے ہے۔

خلیق

میر حسن کے بیٹے میر مستحسن خلیق اک نئے طرز کے موجد ہوئے
مرثیہ جو چو مصرعہ ہوا کرتا تھا اُسے اُنہوں نے مسدس بنادیا
ان کا کلام وہی روش رکھتا ہے جو خاص دلی کی تھی۔ ناسخ کی دراز دستیوں

ہو کر بر دستیوں اور سینہ زوریوں سے دُور رہکر دادِ سخن دیتے رہے۔ ضعف پیری کی شکایت میں فرماتے ہیں:۔

مجرائی طبع کند ہو لطف بیاں گیا
دنداں گئے کہ جوہر تیغِ زباں گیا
گذری بہار عمر خلیق اب کہیں گے سب
باغ جہاں سے بلبلِ ہندوستاں گیا

انیس

ان کے صاحبزادے میر ببر علی انیس جب اس میدان میں آئے تو رنگ بہت کچھ بگڑ چکا تھا۔ ناسخ کا رنگ گھر گھر چڑھ چکا تھا۔ شُستہ و رفتہ زبان۔ مطابق فطرت شاعری اس وقت کے مذاق سے دُور جا پڑی تھی۔ اس وجہ سے انیس کا کلام سادہ اور ایک حد تک پھیکا سمجھا جانے لگا۔ انہیں ضرورت ہوئی کہ اصلی شاعری اور فصاحت و بلاغت کے صحیح معنی و مفہوم کو سمجھائیں۔ چنانچہ اپنے خاندان میں حسن و خلیق کے نقشِ قدم پر رہکر فطری شاعری و جذبات حقیقی کو بتاتے اور اپنے گھر کی زبان کو پیش کرتے ہوئے ہمیشہ کہتے رہے:۔

"اس احاطہ سے جو باہر ہے وہ بیرونی ہے"

یہ ان کے مرثیہ "نمک خوان تکلم" کا ایک مصرعہ ہے۔ اشارہ یہ ہے کہ ہماری زبان و شاعری لکھنؤ کے طرزِ جدید سے الگ ہے چنانچہ فرماتے ہیں:۔

جدّ و آباد نے سوا دز کی تقلید نہ ہو
لفظ مغلق نہ ہو گنجلک نہ ہو تعقید نہ ہو

ظاہر ہے کہ مغلق و گنجلک وغیرہ کا اشارہ ناسخی طرز کی طرف ہے پھر
صراحتاً کس خوبصورتی سے دھراتے ہیں :۔

در دِ سر ہوتا ہے بے ربط نہ فریاد کریں
بُلبُلیں مجھ سے گُلستاں کا سبق یاد کریں

شاعری اور زبان کا معیار قائم کرتے ہوئے یوں گویا ہیں :۔

روزمرہ شرفا کا ہو سلاست ہو وہی
لب و لہجہ وہی سارا ہو متانت ہو وہی
سامعیں جلد سمجھ لیں جسے صنعت ہو وہی
یعنی موقعہ ہو جہاں جسکا عبارت ہو وہی

اب تصریح ملاحظہ ہو :۔

ہے کجی عیب مگر حُسن ہے ابرو کے لئے
سُرمہ زیبا ہے فقط نرگس جادو کے لئے
تیرگی بد ہے مگر نیک ہے گیسو کے لئے
زیب ہے خال سیہ چہرۂ گلرو کے لئے

داند آنکس کہ فصاحت بہ کلامی دارد
ہر سخن موقعہ و ہر نکتہ مکانے دارد

میرانیس نے یہ ایک ایسی کسوٹی قائم کر دی ہے کہ جب تلک اُردو زبان
وار دو شاعری دنیا میں ہے کلام اسی کسوٹی پر پرکھے جاتے رہیں گے
اگر اس محک نے کہیں کھوٹ بتائی تو سمجھئے کہ کلام معیار سے گرا ہوا ہے

انیس نے اُردو شاعری کو عجب بلندی پر پہنچا دیا۔ سلاستِ زبان ترکیب محاورہ۔ بندشِ الفاظ۔ معنیٰ آفرینی۔ عروجِ تخیل۔ جذبات نیچرل سین۔ سائیکولوجی۔ فلسفہ۔ رزم۔ بزم۔ اخلاق۔ پند و نصائح خود داری۔ تحفظِ ناموس۔ شرم وحیا۔ ایمان و کفر۔ مختصر کوئی سی چیز بھی جسکی گنجایش کلام میں ہو سکتی تھی اُسے چھوڑا نہیں۔ واقعات کو اس خوبصورتی سے بیان کرتے ہیں کہ تصویر سامنے آجاتی ہے۔ صبح کی کیفیت:-

پھولا شفق سے چرخ پہ جب لالہ زارِ صبح
گلزار شب خزاں ہوئی آئی بہارِ صبح
کرنے لگا فلک زرِ انجم نثارِ صبح
مشغولِ ذکرِ حق ہوے طاعت گذارِ صبح
تھا چرخ اخضری پہ وہ رنگ آفتاب کا
کھلتا ہے جیسے پھول چمن میں گلاب کا

صبح ہی کے سین میں ایک جگہ مرغانِ آبی کے عادات کی تصویر یوں کھینچتے ہیں:-

پتّا ہلا تو رہگئے پَر تولتے ہوئے
چٹکی کلی تو ساتھ اُڑے بولتے ہوئے

یاد آگیا زیب النساء نے بھی ایک جگہ ایسی ہی تصویر کھینچی ہے۔ کہتی ہیں:-

آہو ز من آموخت بہنگام رمیدن
رم کردن و برگشتن و استادن و دیدن

تصویرِ حزن واندوہ اس طرح کھینچتے ہیں۔ اور سچ تو یہ ہے کہ چوتھے مصرع میں انیسؔ کو معراجِ کلام کا حصول ہوا ہے:۔

وہ بیوطنی رات وہ جنگل کی ڈرانی
بھوک ایکطرف ایکطرف تشنہ دہانی
بچوں کا مچلنا کہ منگا دو ہمیں پانی،
اور نہر کے بہنے کی صدا اُوورسے آئی

بے بسی کی اس سے بہتر مثال دنیا میں نہیں مل سکتی۔
شکایتِ زمانہ اس طرح کرتے ہیں:۔

سب دل ہیں مکدر کوئی دل صاف نہیں ہے
اس عہد میں سب کچھ ہے پر انصاف نہیں ہے

فلسفۂ حیات بعد از ممات کو یوں نظم کرتے ہیں:۔

خود نوید زندگی لائی قضا میرے لئے
شمعِ کشتہ ہوں فنا میں ہے بقا میرے لئے

فلسفۂ عروج و زوال کو یوں بیان کرتے ہیں:۔

کسی کی ایک طرح سے بسر ہوئی نہ انیسؔ
عروجِ مہر بھی دیکھا تو دوپہر دیکھا

مرثیہ و سلام سینکڑوں لکھے۔ رباعیاں نہ معلوم کتنی کہیں۔ اور لطف یہ کہ ہر میں ایک نرالی ادا۔

ادنیٰ یا مکروہ چیز کو اعلیٰ و محبوب کر دکھانا شاعری کی ایک خاص صنعت ہے

چنانچہ قبر جیسی مکروہ و ڈراؤنی چیز کو اس طرح محبوب بناتے ہیں :-

رباعی

مرمر کے مسافر نے بسایا ہے تجھے
دکھ درد اٹھا کے پایا ہے تجھے
کیونکر نہ تجھ سے لپٹ کے سوؤں اے قبر
میں نے بھی تو جان دیکے پایا ہے تجھے

غالب کا ایک شعر اسی صنعت میں یاد آگیا :-

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا
جامِ جم سے تو میرا جامِ سفال اچھا ہے

اللہ اللہ! کیا طبیعت پائی تھی۔ مضامین دریا کی طرح اُمڈے چلے آتے تھے۔ اضافِ سخن سے کس کس کو لکھوں کس کس کی تعریف کروں۔ واقعہ یہ ہے کہ انیسؔ نے زبان کو اپنے کلام سے مالا مال کر دیا۔ اردو میں وہ وسعت پیدا کر دی جو کسی کے خواب و خیال میں نہ تھی۔

دبیر

مرثیہ میں ناسخی رنگ میر ضمیر کیوجہ سے آیا جنکے شاگرد مرزا دبیر ہوئے۔ علمی قابلیت نے دبیر کے کلام کے نقص کو بہت کچھ چھپا دیا تھا۔ مگر پھر بھی اکثر جا و بیجا تاویلات کے شکار بنے ہی رہے۔ بینیہ مضامین البتہ خوب باندھتے تھے مگر لطفِ زبان نہیں۔

مونس

انیسؔ کے کمال کو ان کے خاندان میں دوسرا نہیں پہنچا۔ چھوٹے بھائی میر مونسؔ کا کلام بھی بڑے پایہ کا تھا۔ مگر بھائی کے سامنے نہیں چمکا۔ انہوں نے غزلیں بھی کہیں۔ کلام میں بلاکی

نزاکت و پاکیزگی ہوتی تھی۔ ایک مضمون سودا اور میر سے لڑ گیا ہے

سودا — سودا کے جو بالیں پہ ہوا شور قیامت
خدامِ ادب بولے ابھی آنکھ لگی ہے

میر — سرہانے میر کے آہستہ بولو
ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

مونس — مونس کی گلستاں میں ابھی آنکھ لگی ہے
بلبل یہ ترا شور مچانا نہیں اچھا

وحید — میر وحید کی عمر نے افسوس وفا نہ کی ممکن تھا کہ عروج
میں انیس تک پہنچ جاتے۔ اِن کا مرثیہ :-
بخدا فارس میدانِ تہوّر تھا حُر

اقسام صنعت سے مملو ہے۔ شکایت روزگار میں فرماتے ہیں :-
پیس ہاں اے دَور گردوں تو وحیدِ زار کو
چشم بدبیں میں نہ کھٹکے سرمہ سا ایسا تو ہو (سلام)

رشید — نواسے پیارے صاحب رشید بڑے قادر الکلام گذرے
ہیں۔ زبان کی لطافت کو کیا بیان کیا جائے۔ نانا کے ہم پلہ تھے۔ مرثیہ میں
ساقی نامہ پر زیادہ زور دیتے تھے۔ اور اُس سے مقصود خراجِ تحسین لینا تھا
افسوس یہ بلبلِ ہزار داستان بھی چمن خالی کر گیا ہائے لطفِ زبان! یہ اُنکے ساتھ گیا
پرانی روش میں دائرہ کو محدود پاکر بعضوں نے جدت طرازی کی
اور ان کے کلام بڑی حد تک مقبول خلائق ہوئے۔

حالی - اکبر

ان میں حالی و اکبر و اقبال خاص کر قابلِ ذکر ہیں۔ حالی کا کیا کہنا۔ غالب کے شاگردِ رشید اور پھر اہلِ زبان۔ اِن کا مسدس ایسا مقبول ہوا کہ آج تک زباں زدِ خواص و عام ہے اور واقعہ تو یہ ہے کہ اس مسدس نے ہندوستان کی مسلم دُنیا میں ایک نئی روح پھونک دی۔ اکبر نے جدت طرازی ضرور کی۔ ریٹائر کے میدان میں خوب چمکے۔ مگر صراطِ مستقیم سے ہٹے نہیں کیا خوب فرماتے ہیں:-

پرِ شکستہ ہوں قفس میں نہ رہا ذوقِ چمن
وُلولے دِل کے گئے قوتِ پرواز کے ساتھ

اقبال نے شکوہ کی بدولت شہرت پائی اور خوب پائی۔

شاد

متاخرین میں خان بہادر میر علی محمد شاد عظیم آبادی دلّی کی روشِش کے دلدادہ تھے۔ کلام نہایت پاکیزہ اور ریختہ ہوا کرتا تھا۔ کہنہ مشقی نے بلا کی قدرت پیدا کر دی تھی۔ بڑا ریاض کیا تھا خود فرماتے ہیں:-

شاعری کھیل نہیں ہے جسے لڑکا کھیلے
مَیں نے چھبیس ۲۶ برس اسمیں ہی بیلن بیلے

غزلیں بہت مقبول ہوئیں۔ کلام کا کیا کہنا۔ سُبحان اللہ جذبات ولطافت سے مملو۔ زبان رُفتہ و شُستہ محاورے صحیح۔ فرماتے ہیں:-

ساتھ دِل کے گئے فقط اے آہ تو مشکل میں ہے ٭ کشمکش میں ہیں امیدیں آرزو مشکل میں ہے

تغزل کا رنگ کیسا پیارا انکالا ہے :۔

جذبِ بلبل کھینچتا ہے اک طرف اک سو صبا
دم گھٹا جاتا ہے کیا پھولوں کی بو مشکل میں ہے

ذیل کے شعر میں کمال کیا ہے۔ زمانہ کی کج رفتاری کو یوں بیان فرماتے ہیں

زندگی ہے دل کو پیاری موت عزت کو پسند
بات نازک ہے بہت اے شاد تو مشکل میں ہے

ابھی متاخرین کا دور باقی ہی تھا کہ اردو شاعری نے ایک اور کروٹ
یورپ کے دلدادے مغربی تہذیب کے متوالے اُردو شاعری میں
کیٹس و براؤننگ۔ ورڈسورتھ و بائرن۔ گیٹسے و شافنر کا نعم البدل
لگے ڈھونڈھنے! شاعر کے کلام میں پیغام کے متلاشی ہے۔ گوہر مقصد
ہاتھ نہ آیا تو خود خامہ فرسائی شروع کر دی۔ اسکا نتیجہ جو ہوا وہ آجکل کی شاعری سے
ظاہر و باہر ہے۔ یہ بحث طویل ہے اسکے لئے ایک مستقل مضمون کی
ضرورت ہے آئندہ انشاء اللہ
اگر موقع ہوا تو پیشکش سلسلہ معین
کروں گا

(مرتضیٰ علی)

اسلامی سائنس وطب اور موجودہ یورپ

محترم حضرات!

عنوان کی وسعت کے لحاظ سے واجبی طور پر خیالات کا اجتماع یا
امی کارناموں کی مکمّل شیرازہ بندی ایک اس مختصر سی صحبت میں جو کہ
ستند و خورند و برخاستند کی مرادف ہو غالباً غیر متوقع سمجھنا چاہیے
لئے کہ سائنس کا ہمہ گیر لفظ نہ صرف آکسیجن و ہائیڈروجن تک محدود نہ ہے
سکی وسعت مفہوم کا سلسلہ انسانی زندگی اور ذہنی کاوشوں کے تقریباً
عبہ سے وابستہ ہے۔ پھر بھی میں نے کوشش کی ہے کہ ضروری امور پر
تقائی حیثیت سے بہ تقابل ترقیات یورپ تسکین بخش روشنی پڑجائے
پرستاران یورپ کی نگاہوں سے تاریکی کے پردے اٹھتے ہوئے نظر آئیں
مسلمانوں کے علم ہئیت و نجوم۔ کمسٹری و نباتات۔ حیوانات و جمادات
ت وارضیات پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالنا اس زنجیر کی دوسری کڑی

اسی مضمون میں خیال اختصار ہر جگہ دامنگیر رہا اسی لئے سامعین
کا ذوقِ طلب اگر کسی جگہ تشنگی محسوس کرے تو اسکو بھی فن تحریر کے اراد ی
خیال فرمائیں۔ سمندر کو منتقل کرنا اور وہ بھی ایک دفعہ کچھ آسان نہ تھا

اس لئے ظرف قدح خوار کی حیثیت سے میں نے بلانوش ہونے کی سعی نہیں کی ہے۔ یار زندہ صحبت باقی۔
انسانی سوسائٹی کا بہترین اصول ہے۔ خیر سُنئے ۔

اگر بہ سینۂ این کائنات در نروی ✢ نگاہ را بہ تماشہ گذاشتن ستم است

مختصراً طب و سائنس کی ترقی و تنزل کے ساتھ ساتھ اس حقیقت کو بھی تاریخی حیثیت سے منکشف کیا جاتا ہے کہ اب تک اسلامی سائنس وطب نے یورپ کی مایہ ناز ڈاکٹری میں کیا انقلاب پیدا کیا۔ یا بالفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ دونوں کیونکر مختلط اور متفرق ہوئیں اور کن اثرات کے ماتحت یورپ والوں کو ایشیائی یا مشرقی سرمایوں سے فائدہ پہونچا۔ اور کیونکر؟ بقول مستشرق علامہ میکس میرہوف۔

"اسلامی سائنس وطب کے خزانے ابھی بالکل محفوظ ہیں۔ قسطنطنیہ، دمشق بغداد، موصل، فارس، ہندوستان اور اسپین کے طبی سرمایوں کو ہاتھ بھی نہیں لگایا گیا ہے۔ صرف چند سال سے انکشاف حقیقت کی دھیمی دھیمی روشنی ان خزانوں پر پڑنا شروع ہوئی ہے۔ جس نے ہمارے پچھلے خیالات کو بالکل بدل دیا ہے"۔ غرض آمدم برسر مطلب

یہ امر تاریخی مسلمات سے ہے کہ عرب مسلمان جب قسطنطنیہ اور سلطنت فارس کی طرف بڑھے تو یونانی طب و سائنس کا چراغ صدیوں سے افسردہ ہو چکا تھا اسلئے براہ راست عربوں کو یونانیوں کا مرہون منت نہ ہونا پڑا بلکہ اس تاریخی مغالطہ کی جو آج بھی اکثر اشخاص کے ذہن میں متمکن ہے

اصل حقیقت یہ تھی کہ سقراط، بقراط، ارسطو اور دیگر فلاسفر کے شارحین
مثلا Aetions ۵۵۰ء Paul of Aegina. ۶۴۲ء
Fheopoloo. ۶۹۰ء وغیرہ اس وقت اسکے مالک تھے۔ انھیں سے
مسلمانوں نے اسے حاصل کیا بالخصوص جندیشاپور اسکا وہ اسلامی مرکز
تھا۔ جہاں سے کہ ۶۶۱ء سے لیکر ۷۴۹ء تک سائنس و فلسفہ طب
و حکمت کا آفتاب تمام دنیا پر چمکتا رہا۔ تراجم کی بنیاد یہیں پڑی ہندوستانی
چینی، رومی، و یونانی طب و حکمت کا اختلاط اسی کی اثرات سے وقوع
پذیر ہوا۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ فلسفیانہ صلاحیت دماغ پیدا کرنے کے بعد
اسلاف کے خزانوں کو بھی اُنھوں نے اپنا بنالیا یعنی ان سے ایمانداری کے
ساتھ متمتع ہوئے۔ اِن کی تصانیف سے بلا تعصب فائدہ اُٹھایا۔ اور جو
کتابیں سریانی عراقی یا لاطینی زبانوں میں تھیں۔ عربی میں منتقل کرلیں۔
میراث اسلام Legacy of Islam مولفہ ارنلڈ کے صفحہ ۳۱۴ پر ایک
حوالہ موجود ہے۔ کہ

"۵۳۶ء ہی سے ان علوم کے تراجم ہونے لگے تھے۔ اور اس دور کا خاص
مترجم Sergins یعقوبی میوسپٹامیا یا عراق کا متوطن تھا"

بہر نوع فلاسفۂ یونان کا مترجم کوئی ہو یہ حقیقت آشکار ہے کہ بنی عباس کے
مشہور خلفا جعفر، منصور، ہادی، ہارون، مامون کے زمانے میں یہ علوم و فنون
پایۂ تکمیل کو پہونچے۔ بنی امیہ نے اپنی فاتحانہ یا مبلغانہ روح کے ساتھ
نظریات کی طرف کم توجہ کی۔ پھر بھی علم دوستی کے خلاف کوئی ناجائز فعل

نہیں کیا۔ تاریخ شاہد ہے کہ اس فاتحانہ دور میں بھی دارالسلطنت دمشق
میں تعلیم یافتہ عیسائی یہودی اور فارسی النسل ماہر فن عربی ناموں کے س
آتے تھے اور درباری طبیب و کاتب ہوتے تھے۔ جذبہ فتوحات کے باوجود
اسلام کی علم پرستی کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ ۶۶۱ء سے ۷۴۹ء
تک (دور امیہ) ایسا واقعہ کوئی نہیں ملتا ہے۔ جو عیسائیت کے زمانہ شباب
کے مذہبی جنون کا مظہر ہو۔ جب یہ لوگ افریقہ و مغربی ایشیا پر چھا گئے
انھیں مذہبی مسلمانوں نے سائنس و فلسفہ کے ایرانی و یونانی اثرات کو قطعاً
نقصان نہیں پہنچایا اور عیسائیوں کے اسقفان اعظم کے کیطرح دہریت کے
ڈر سے خائف نہ ہوئے بلکہ توغل و انہماک کے ساتھ اس معرکہ کو بھی سر کیا
۷۵۰ء سے اسلامی حکومت اور بالخصوص طبی سائنس کے شان و شکوہ کا
دور شروع ہوتا ہے۔ جابر ابن حیان الصوفی اپنے دور کی عجیب و غریب ہستی تھا
لاطینی زبان میں اسکو جبر سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہ شخص فن
کیمیا یا کمسٹری کا ابوالآبا تھا۔ اور دسویں صدی سے اسکی تصنیفات کا پتہ
چلتا ہے۔ مورخین کا خیال ہے کہ اس کا باپ ایک عطار تھا۔ جسکا رشتہ
برمکی خاندان سے بھی ملتا تھا۔ اور علمی تحقیقات کے لحاظ سے بڑی عظمت کا
انسان ہے۔ اسکے بعد سے جرجیس بخت یشوع، یوحنا بن
ماسویہ، حنین بن اسحاق عباسی، شاناق، منکہ، سالی کا وغیرہ عباسی دربار
کے مشہور چشم و چراغ ہیں۔ جنھوں نے ترجم کے ذریعہ سے طب و فلسفہ
نیچرل سائنس اور حکمت اور مختلف علوم و فنون کو زندہ کیا۔ پھر قطادین لوقا

ثابت بن قرہ جیش وغیرہ کی باری آٹھویں صدی میں آتی ہے۔ جنھوں نے
علم الادویہ اور طب اور نیچرل سائنس کے مختلف شعبوں میں معتدبہ اضافہ
کیا غرض یہ تراجم کی سرگذشت تھی جسکی تفصیل مع اسماء و کُتب اگر کوئی دیکھنا
چاہے تو علامہ شبلی نعمانی کے مشہور مضمون تراجم کی طرف رجوع کرے
ہم طبی سائنس کے موضوع سے ہٹنا نہیں چاہتے۔ اس لیے اب انتہائی
کارناموں کو چھوڑ کر اُن اُمور کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جو مسلمان
سائنس دال یا طبیبوں کی ذاتی قابلیت کا حاصل تھے۔ فہرست
کُتب کیطرف متوجہ ہونا اس مختصر کتاب میں ناموزوں ہے۔ اس لئے
ہم صرف ناموں اور بعض مخصوص ہستیوں کے حالات پر مختصراً اکتفا کرینگے
لیکن اس سے قبل یہ بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ آناً فاناً ترقی کی بجلی عرب ایسی
قوم میں کن اثرات کے ماتحت دوڑ گئی۔ ہمیں یہ دیکھکر مسرت ہوتی ہے کہ
یورپ کے نقاد اس ترقی کا سہرا بھی مذہبی روح کے سَر باندھتے ہیں۔
گویا کہ موجودہ انقلاب کے باوجود اگر مذہب کو افراط و تفریط سے بچا کر
صراط مستقیم یا دین فطرت تک محدود رکھا جائے تو یہ ماننا پڑتا ہے۔ کہ
دہریت کی روح کے بجائے مذہب کی سچی روح زیادہ منفعت بخش ثابت
ہوتی ہے۔ خیر حقیقتِ حال جو کچھ بھی ہو یورپین مصنف بالخصوص ہمارے
علمی دوست مسٹر Mex Meyrhof ام ڈی میکس میرہوف کا
خیال ہے کہ

"ان مسلمانوں میں سائنس و فلسفہ طب و نجوم ہیئت و ریاضی کی روح

اور ہمہ گیر قبولیت کو بھی رسم حج سے زبردست علاقہ ہے اسلامی تجارت کیطرح ان علوم وفنون کی اشاعت بھی مذہبی انسانوں کی سیر اور سیاحتوں سے وابستہ ہے۔ جنکے لئے ہندوستان واندلس ایشائے کوچک، وافریقہ ٹونس الجزائر فارس وعرب ومصر واسپین چین وجاوا سب یکساں تھے۔ مذہبی سیاحت ذہنی سیاحت کے لئے اکسیر کا حکم کرتی تھی۔ اور یہی مسجدیں اور علمی انجمنیں اُس دور میں لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتی تھیں۔ زائرین کعبہ نماز کی خاطر منزل بمنزل مسجدوں میں جاتے تھے۔ اور مشہور علماءُ وفضلاءُ کی ملاقات سے بہرہ یاب ہو کر اُس علمی روح کو حاصل کرتے تھے۔ جواُن کو کسی نہ کسی دن چمکا دیتی تھی۔ اس طور پر قدر تاً بیش بہا معلومات کے ذخیرے ایک ملک سے دوسرے ملک میں اور ایک طبقہ سے دوسرے طبقہ کو منتقل ہوتے رہتے تھے۔"

حتیٰ کہ ہمارے یہاں کا موجودہ طریقہ تعلیم آج بھی یونانی و قرطبی تعلیم کی یادگار ہے۔ مسجدوں یا مسجد سے ملحق مدرسوں میں طلباء کے غول کے غول بیٹھے ہوئے ہیں۔ استاد کسی کھمبہ سے ٹیک لگائے ہوئے علوم کے دریا بہا رہا ہے اور تشنگانِ علم سیراب ہو رہے ہیں۔ اگر کوئی جامع ازہر جا کر یہ تماشا دیکھے تو عجب پُرلطف معلوم ہوتا ہے۔ غرض خلاصہ یہ ہے کہ اسی مذہبی پرتو نے دنیائے طب وسائنس میں بھی ایسے افراد کو پیدا کر دیا کہ زمانہ صدیوں کے انقلاب کے بعد بھی ایسے مسلمانوں کو نہیں بھُلا سکا۔

ان کے ذاتی کارناموں کے سلسلے میں غالباً اسلامی عُلوم وفنُون کے

بحرِ بے پایاں پر روشنی ڈالنے کی ضرورت ہے۔ مگر:-

فرصت کہاں کہ اس کی تمنا کرے کوئی

اور اس کے ماتحت بہت کچھ ثبوت موجود ہے۔ پھر بھی فن طب کے متعلق مختصراً یوں سمجھ لینا چاہیئے کہ الکندی متوفی ۸۷۳ء کی عظمت کا اندازہ اوسکے دوسو پینسٹھ رسالوں سے ہو سکتا ہے۔ جو بحیثیت معلومات غیر مُستعار ہونے کے علاوہ مختلف موضوعات پر مشتمل ہیں۔ بقول مُستشرقین۔

"[1] ان میں کے پندرہ[۱۵] علم فلکیات پر مشتمل تھے۔ بعض موسیقی سے بحث کرتے تھے۔ بعض عکس روشنی اوزان مناظر و مرایا کی حقیقت پر روشنی ڈالتے تھے۔ لاطینی تراجم میں صرف موخرالذکر ہی ایسے موضوع ہیں جنکے مطالعہ نے روجر بیکن Roger Bacon. اور دوسرے مغربی سائنس دانوں کو بصیرت کی راہ دکھلائی۔"

اِسی قدیم دور کے مطالعہ سے جس کو آج ۱۰۵۹ برس ہوتے ہیں اس حقیقت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ کہ مشین کے ذریعہ سے مختلف طبی تمدنی اور معاشرتی سہولتیں بہم پہونچائی گئیں تھیں۔ اور طبی سائنس کے ماتحت یہ مذاق عموماً نشو ونما پاتا تھا۔ چنانچہ:-

"[2] مصر و میسوپوٹامیا میں بسلسلہ ایجادات آب پاشی کے مختلف مشین ایجاد ہوئی تھیں اس فن کے یہ مختلف تحریکوں اور پھیوں یا پُرزوں کے توازن اور اُن کی حرکات و سکنات پر کتابیں لکھی گئیں تھیں۔ اور سب سے پہلی کتاب جو میکانک Mechanics. پر ملتی ہے وہ ۸۶۰ء لکھی ہوئی

محمد احمد و حسن ولد موسیٰ ابن شاکر کی مجموعی تصنیف جس کا نام کتاب
الحیل ہے۔ اس میں گرم ٹھنڈا پانی رکھنے کے برتن یا تھرماس وغیرہ
پر سائینٹفک طریقے سے بحث کی گئی ہے (جسے ہم یورپ کا کارنامہ
سمجھتے ہیں) اسی طرح اس قسم کے کھلونے اس دور میں پائے جاتے
ہیں۔ جو سائنٹفک نقطہ نگاہ سے بولتے تھے۔ اور دل چسپ آوازیں
پیدا کرتے تھے۔ اور خود بخود متحرک ہوتے تھے"

حتیٰ کہ دیگر مصنفین کے عینک یا چشمہ اور مختلف آئینوں اور آلہ عکاسی
Obscure Camera. کا خاکہ ملتا ہے جو بعد کو یورپ میں
نقش ثانی کی حیثیت سے چمکا۔ جوزیف ل مصنف تمدن عرب کا خیال ہر
کہ حقیقتاً اس ایجاد کا سہرا ابن الہیثم کے سر ہونا چاہیے جو اس کا موجد تھا مگر
یورپ والوں کے تعصب سے روجر بیکن کے طرف منسوب کیا گیا۔ خیر
اس دنیائے سائنس میں اور بالخصوص طبی سائنس کی ترقی میں بوعلی سینا
سنہ ۹۸۰ او ۱۰۳۷ء کا نام ہی لینا کافی ہوگا اس کی تصنیفات کی پرستش بھی یورو پین
فلاسفروں اور اطبا میں بجا طور پر کیجاتی ہے۔ ایسی عظمت و علمی شخصیت
کے انسان دنیا میں کم ہوتے ہیں۔ بہرنوع بقول مستشرقین۔ موسیقی۔ طب
نجوم ہیئت۔ فلکیات طبعیات ریاضیات سبھی پر اسکے زبردست مقالے
موجود ہیں۔ یہ شخص دنیائے اسلام اور مشرق کے لئے مایۂ ناز ہے۔
"یورپ کی طبی سائنس پر اس کی تصنیفات اصلاحات و خیالات کا زبردست
اثر پڑا قانون فی الطب میں اسنے یونانی و عربی خزانوں کو یکجا کیا جسکو عربی

مذاق اور مسلمانوں کی قوت نظم و ترتیب کا زبردست شاہکار سمجھا جاتا ہے۔ اسی طبی دائرۃ المعارف یا ان سائیکلوپیڈیا میں مفردات و مرکبات، جڑی بوٹی کے خواص دواسازی اور تمام اعضاء انسانی امراض و علامات و اصول تشخیص سے نہایت ربط کے ساتھ بحث کی گئی ہے۔ اس کتاب کی محبوبیت کا یورپ میں یہ عالم ہے کہ پندرھویں صدی کی آخری تیس برس میں اس کی اشاعت سولہ[۱۶] بار ہوئی۔ پندرہ[۱۵] بار لاطینی میں اور ایک بار یونانی میں شائع ہوئی۔ Gerard, جررڈ نے بارھویں[۱۲] صدی میں اس کا ترجمہ کر لیا تھا۔ پھر سولھویں صدی میں بیس بار سے زیادہ اسکے مکمل اڈیشن نکلے۔ ان کے علاوہ اسی کتاب کے مختلف مقالے جو کہ جابجا یورپ میں شایع ہوتے رہی اس دائرہ اشاعت سے مستثنےٰ ہیں۔ علیٰ ہذا یورپ میں اسکے شارحین بھی بے شمار ہیں۔ جنھوں نے اسکے خرمن علم و فضل سے خوشہ چینی کر کے اپنے آپ کو مشہور و معروف بنایا تاریخ شاہد ہے کہ نصف اٹھارویں صدی تک اس کا مطالعہ اور اشاعت یورپ کی طبی سائنس کی روح رواں تھی۔ مشرق میں یہ اب بھی ہر جگہ موجود ہے۔"

غرض یہ امر بدیہی ہے کہ اسلام کی ایسی عظیم الشان ہستی کی پرستش نے یورپ کے قوت اختراع و ایجاد اور طبی سائنس کی ترقی کیا کچھ اثر نہ دکھلایا ہو گا۔ پھر بھی نہیں بلکہ یورپ ہر شعبہ میں اس کا خوشہ چین ہے۔ اسی رئیس الاطباء کے پندرہ[۱۵] رسالے علم طب پر اور سو مقالے علم العقائد طبعیات ہیت علم الا

اور موسیقی پر پائے جاتے ہیں جو اکثر عربی میں ہیں۔ یہ ہمدان کی خاک کو جہاں کہ اس کا مدفن ہے عزت و احترام کا مرکز بنائے ہوئے ہے۔ ہماری رائے میں ان قابل فخر مسلمانوں کے کارنامے صرف شعبۂ سائنس کے بیان کرنے کے لئے بھی ایک دفتر چاہئے۔ اب ہم صرف مخصوص نام بطور فہرست پیش کرتے ہیں۔ یہ لوگ اسلام کے عہد زرین کی بے حد نمایاں ہستیاں ہیں جنہوں نے مشرق و مغرب دونوں کو اپنے فیوض سے مالا مال کر دیا۔ اور موجودہ ترقیاں انہیں کے نقش اولیں کی یادگار ہیں۔ رازی، جابر کوفی علی حسن ابن سینا صاحب الشفاء و القانون ابوالقیس جراح قرطبی علی بن رضوان ۱۰۶۷ء ابوالمنصور موفق ہراتی ۹۷۵ء ماہر ادویہ سازی جس نے ۵۸۵ ادویہ کی تحقیق کی ماسوا یہ بغدادی ۱۰۱۵ء ابن وافد مصری ۱۰۷۰ء علی بن عیسے بغدادی ۹۹۵ء ماہر مناظر و مرایا ابوریحان بیرونی ۹۷۳ء مخاطب بہ "استاد" طبیب نجومی جغرافیہ دان ماہر طبعیات مہندس مؤرخ مصنف المسعودی مصری متوفی ۹۷۵ء جو دنیائے اسلام کی عجیب و غریب ہستی تھا اسکی مشہور و معروف تصنیف مروج الذہب کو ایشیا اور یورپ والے کبھی نہیں بھلا سکتے۔ اسکے مطالعہ سے دنیائے سائنس کے بہت سے انکشافات وابستہ ہیں اور تھے۔ چنانچہ بسا اوقات ہماری نگاہیں اسکے موقر بیانات سے دوچار ہو جاتی ہیں تو موجودہ انکشافات سائنس توارد کیطرح نظر آتے ہیں۔ اس نے زلزلہ اور بحر الکاہل کی امواج و طوفان کی حقیقت پن چکی کے فنی نشیب و فراز اور اسکی اصلیت

جو خاص اسلامی ایجاد کا شرف رکھتی ہے ساتھ ہی ساتھ مسئلہ ارتقاء انسان کو اس انداز سے بیان کیا ہے کہ موجودہ یورپ کے بڑے بڑے بوزنہ پرست یا ارتقا پرست انسان کی تمام نظریات پر خاک پڑجاتی ہے۔

الفارابی ماہر موسیقی جسکے نقش قدم کی تقلید سے ابن ندیم کی فہرست العلوم ۹۸۰ء اور محمد خوازرمی کی مفتاح العلوم ایسی عظیم الشان کتابیں عالم وجود میں آئیں۔

"ابو علی علی حسن بن ہشیم بصروی ۹۶۵ء ماہر مناظر مرایا Optics. جس کی شخصیت پر آج بھی دنیا کو ناز ہونا چاہیے اسی کی مقالات نے روشنی کی حقیقت قوس قزح کی حیثیت ہالہ اور گرہن کی فطرت اور اسی قسم کی سینکڑوں چیزیں جنکو دنیا سے متعارف کیا سایہ اور گرہن وغیرہ پر اسکی بعض تصنیفات اصول ریاضی کی صحت کی حامل ہیں جو اسکی دور حیات کی دس برس کا حاصل ہیں۔ اسی نے مختلف دھاتوں کے بیضوی اور کروی آئینہ بنائے اور موجودہ آئینہ کے مصالحوں اور کل کائنات کو قدیم دور میں منکشف کیا۔ آتشی شیشہ کے متعلق اسکے معلومات یونانیوں کے معلومات سے کہیں زیادہ ہیں اسکی تصنیفات میں اُن اصولوں کا پتہ چلتا ہے۔ جو آج فن عکاسی کی روح رواں ہیں۔ تصویر و نقوش کا اُلٹا عکس لینا گھٹانا بڑھانا چھوٹا بڑا بنانا علیٰ ہذا لقیاس شعاعوں کو ایک مرکز کی طرف متوجہ کرنا Focussing ساتھ ہی ساتھ مختلف رنگ اور دائروں کی ساخت و پرداخت اور اسی قسم کے اور سائنٹفک مطالب پر اس نے جو کچھ

ل صفحہ ۳۳۴ بحوالہ سر آرنلڈ

لکھا ہے۔ ایک موجد کی شان کا مظہر ہے حتے کہ فوٹوگرافی کے
کیمرہ یا آلہ عکاسی کا ہو بہو خاکہ اسکی تحریروں میں ملتا ہے۔ اسکے بعد زکریا
قزوینی ہے جو دور فاطمی کی عظیم الشان ہستی تھا ابن خطیب غرناطوی ۱۳۱۳ء–۱۳۷۴ء
محقق طاعون مورخ سیاست داں و طبیب تھا۔ علی عباس ایرانی متوفی
۹۹۴ء طب کی انسائکلوپیڈیا الکتاب الملکی کا مصنف ہے اس کی
جامع کتاب کا لاطینی میں چند بار ترجمہ ہوا شہاب الدین مصری ۱۱۵۴ء
ماہر ادویہ و تجربات سائنس محمد دمیری مصری ۱۴۰۵ء ماہر علم الحیوانات
زکریا و قزوینی ۱۲۸۳ء مصنف دائرۃ المعارف مشتمل بر حیوانات و نباتات
وحجریات وغیرہ خازنی مروی سنہ ۱۱۳۰ء جس نے پانی اور اسی قسم کی ہر چیز
ثقلِ اضافی Density معلوم کیا اور چند سے بعد اسی کے نظریہ
کو Roger Bacon. روجر بیکن نے اپنا بنا لیا الجزاری سنہ ۱۲۰۶ء
علم میکانک کا ایسا زبردست ماہر تھا جس نے آب و سیماب اوزان شمع
ساعات اور اسی قسم کی چیزوں کو سائنس کی بوالعجبیوں کے ساتھ ایسی ہی
پیش کیا تھا جیسا کہ آجکل ہم کھلونوں کو بازاروں میں دیکھتے ہیں۔ ابن ابی اصیبعہ
Usabia. اسی دنیائے سائنس کا وہ سوانح نگار ہے جس نے
چھ سو طبیبوں کے حالات قلم بند کئے یہ شخص معالج چشم تھا عبد اللطیف عربی
ماہر جراحی تھا غرض بلحاظ انکشاف "حدیث دلکش و افسانہ از افسانہ می خیزد"
سلسلہ کلام طویل ہو گیا کہنا یہ تھا کہ انھیں علوم و فنون کے مجسموں نے
ترتیب کے ساتھ سائنس کو فروغ بخشا اور انھیں کے کارنامے لاطینی و عبرانی

بانوں میں مترجم ہونے کے بعد یورپ کے سامنے پیش ہوئے۔ جنکے مطالعہ سے سائنس وطب کے ہر شعبہ کو یورپ میں چمکا دیا اور Gerard

جرارڈ روجر بیکن Roger Bacon. کوپرنیکس Copermicus.

ماہر نجوم ۱۵۴۳ء پراسیلس Paracelus. رابرٹ بن ۱۶۴۰ء

جیسے فلاسفروں کو پیدا کیا بقول مسٹر میر ہوف۔

"انھیں لوگوں کے بہت سے تراجم لامعلوم الاسم ہم تک پہونچے اور یہی یونانی وعربی سرمایہ یورپ کی بنجر زمین پر سولھویں صدی تک سائنس کی تخم پاشی کرتا رہا تھی کہ سلرنو Selerno. میں قسطنطنین کے اثرات کے ماتحت کچھ ڈاکٹر پیدا ہوئے جنھوں نے علم تشریح وعلم الابدان اور طب وحکمت کے مختلف شعبوں کو سائنس کے اصول پر از سر نو زندہ کیا یہ علم صرف دائیوں تک محدود تھے۔ اسی طرح علم مرایا دمناظر علمی نقطہ نگاہ سے مدون ہوا جو اس سے قبل یقیناً صرف عطائی طبقہ تک محدود تھا رفتہ رفتہ بارھویں صدی کے بعد سے (اسلامی یونیورسٹیوں کے طفیل) یورپ میں دار العلوم کی بنیاد یا اسکیم بارآور ہونے لگی۔

Blogna بیدنا۔ ماٹ پیلیر Padna. لونہ

اور پیرس سائنس کا مرکز بنے۔ ان میں بغداد کے نصاب کے مطابق صرف اسلاف متذکرہ بالا مسلمان فیلسوفوں اور سائنس دان اصحاب کی تصنیفات جو لاطینی میں مترجم تھیں پڑھائی جاتی تھیں یہاں اس دور

تک علمی تجربات کا وجود تک نہ تھا اور علم نباتات وحیوانات اور
طبعیات وغیرہ میں اسلامی نظریات کی تقلید کی جاتی تھی۔ بالخصوص
سولھویں صدی کے آخر تک تشریح اعضا انسانی کا علمی ثبوت نہیں ملتا"
غرض جب یہ لوگ عربی علوم پر متصرف ہو گئے تو سرجری قیام صحت
Hygiene. بالخصوص ہسپتالوں کے نظم ونسق کے متعلق غیر معمولی
ترقی کرنے لگے ۱۳۷۸ء میں گائی ڈی اف مانٹ پلیر نے آب مروارید
موتیا بند کا اپریشن کیا۔ زخموں کے اندمال اور پٹیاں باندھنے وغیرہ کے
فنی حیثیت سے ترقی کی۔ نیچرل سائنس نے بالخصوص پیرس Paris.
کو اپنا مرکز بنایا اور خصوصیت سے ابن رشد کی شرح نے جو فلسفہ ارسطو
علمی ترقی کا سنگ بنیاد قایم کیا۔ اور روجر بیکن البرٹ میگسن اور
Albert Magson. اسکولوں کے دوسرے حضرات
نے مسلمانوں کے گم شدہ خزانوں کو مہیا کر کے اپنے ملک کے سامنے پیش
بالخصوص Raymond ریمانڈ آرنلڈ Arnold
ساکن Villanova ویلوانو نے جابر کی خوشہ چینی کو اپنا
بنایا اور کیمیا کے مشرقی فن کو بانی کیمیا کے فیض سے یورپ میں ایسا
کہ اکسیر بنا کر چھوڑا گو اس وقت Paracelus. کیوجہ
اسلامی سائنس کی روح بر سر زوال تھی پھر بھی ان کی اسلامی تصنیفات
اور بار بار شائع ہوتی رہتی تھیں۔ ۱۸۳۴ء عربی قرابادین کا بلحاظ
کی منفعت کے لئے شائع کیا گیا۔ ۱۸۵۶ء میں ابن بیطار کی مفردات

ئع ہوئی۔ انیسویں صدی[19] کے آغاز تک ادویہ سازی کا طریقہ عربی
ی تھا۔ ۱۸۳۲ء میں .Mechither کی تصنیف ۱۸۰۱ء کی لکھی
ہوئی۔ وائنا میں دوبارہ چھپی۔ اس طرح وہ آلات نشتر اور سوئیاں جو
عمت بو الہیثم اور علی بن عیسے نے آنکھ کی خرابی میں صدیوں قبل استعمال کی
یر معنیں انگلینڈ میں ۱۸۰۷ء اور جرمنی میں ۱۸۴۳ء تک مستعمل رہیں
اسی سلسلہ میں یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ایک نظر شفاخانوں پر
الی جائے جو اسی ذوق علمی اور جذبہ انسانیت کا پرتو ہوتے ہیں۔
یخ بتلاتی ہے کہ مسلمان اسکے موجد ہیں اور اسی لئے یورپ میں
طانی ہمدردی کے خیال اور موجودہ ڈاکٹری کو بحیثیت ارتقا مسلمانوں
ور فیاضی سے بہت کچھ علاقہ ہے۔ چونکہ ہمارا مدعا طب و سائنس ہے۔
حض لئے ہم اس کی بنیادی تاریخ سے بحث کرنے کے بجائے نظم و نسق کی
طرف متوجہ ہوتے ہیں تاکہ موجودہ ڈاکٹری کی تدریجی ترقی کا پیچیدہ راز منکشف
و اور ناظرین لطف تقابل سے بھی محظوظ ہوں۔

"خلیفہ ولید کے بعد بغداد میں سب سے پہلا ہسپتال جو میڈیکل کالج بھی تھا
۸۰۹ء میں ہارون رشید کے حکم سے بنا۔ اور پانچ عظیم الشان شفاخانے
دسویں صدی میں پایہ تکمیل کو پہونچے۔ اسلامی مؤرخ ان کا مجموعی حال اور
دفتری نظام جس انداز سے بیان کرتے ہیں وہ بہت زیادہ قابل عظمت
ہے۔ اور موجودہ میڈیکل کالجوں کے نظم و نسق پر محققانہ روشنی ڈالتا ہے
یعنی ان میں مخصوص قابلیت کے سرجن اور ڈاکٹر طلباء کو لکچر دیا کرتے تھے

کامیاب شدہ متعلمین کو اجازہ یا سند یا ڈپلوما دیا جاتا تھا۔

عطار و دیگر پیشہ ور طبیبوں، فصادوں، حجاموں، کے لئے باقاعدہ

لائسنس مقرر تھے۔ اور ان کی دواؤں وغیرہ کے معائنہ ہوتے تھے۔

بالخصوص تشریح۔ اعضاء انسانی سرجری اور بچوں کے امراض کے

ازالہ اور صحت کے متعلق بہت زیادہ توجہ کیجاتی تھی۔ اس دور میں

پال آف اجینا کی سرجری Paul of Aegina.

مروج تھی سلطنت کی طرف سے باقاعدہ ہدایات کا اجرا ہوتا تھا۔

ہسپتالوں میں عورتوں اور مردوں کے لئے علٰحدہ علٰحدہ وارڈ اور کمرے

تھے۔ ان میں سے بعض شفاخانوں میں لائبریری بھی تھی جو آج عموماً نہیں

پائی جاتی۔ امیدوار فنی حیثیت سے اساتذہ کے ساتھ مطب کیا کرتے

تھے۔ اور ان کو مختلف عملوں اور معائنہ امراض کے ساتھ عملی تعلیم

دی جاتی تھی۔"

یہی مصنف دوسری جگہ اس طرح گہر افشاں ہے۔ کہ :۔

"ہمارے یورپ میں جنگ صلیبی سے پہلے شفاخانہ کا کہیں پتہ نہیں چلتا

اسلئے اس جنگی اختلاط کی بدولت غالباً تیرھویں صدی میں شفاخانے

کی بنیاد یورپ میں فرض کیجا سکتی ہے۔ اور یہ بھی سلجوقی خاندان کے

مشہور شفاخانے بیمارستان یا سلطان مملوک منصور قلاؤن کے

دار الشفا کی بھدی سی نقل تھی۔ جسکو یورپ کے سیاحوں نے دیکھکر

انسانیت اور بنی نوع انسان کی ہمدردی کا سبق حاصل کیا۔

اسلامی شفاخانوں کے زوال کے بعد دنیائے یورپ میں ہر شعبہ کی

تجدید شروع ہوئی۔ اولاً پوپ Innocant

انوسنٹ ثانی نے تیرھویں صدی کے آغاز میں روم کے علاقہ میں

ایک شفاخانے کی بنیاد ڈالی جسکا نام Hospital Sansar Spirits.

تھا۔ اس کے وجود سے یہ مذاق

مغربی یورپ میں بڑھا۔ لوئی داہم شاہِ فرانس نے جنگِ صلیبی میں

ناکامیاب ہوکر واپسی پر ۱۲۵۴-۶۰ء پیرس میں غریبوں کے لئے ایک

جائے پناہ۔ اور شفاخانہ قائم کیا۔ جو تین سو غریب نابیناؤں کے لئے

بنایا گیا تھا۔ مگر اب امراض چشم کے لئے دولت فرانس کا بہترین

ہسپتال ہی ہے"۔

اسی طرح رفتہ رفتہ لاطینی، سریانی۔ و عبرانی تراجم کے مدد سے جو بیشتر مسلمانوں

کے ذہنی ارتقا اور مختلف ایجادات کے مرہون منت ہیں۔ اس فن نے ترقی

کی اور تمام یورپ کو بنی نوعِ انسان کی ہمدردی کے خیال سے مہذب و

شائستہ بنادیا۔ خیر ؎ ہرچہ گیرید مختصر گیرید ؂

اب اس سے زیادہ دلچسپ موضوع پر نظر ڈالئے۔ یعنی یہ کہ اس وقت

دنیائے یورپ پر اس کے کون سے زندہ مگر مٹے ہوئے آثار ہیں۔ جو اسلامی

فلسفہ وطب کی ہمہ گیری کو روز روشن کی طرح ظاہر کرتے ہیں۔ تفصیل تطویل

سے خالی نہیں اس لئے یہ مناسب ہی کہ اشارۃً اُن عربی الفاظ کی طرف توجہ

کو منعطف کیا جائے۔ جو اسوقت بھی یورپ کی زبانوں میں عام طور پر مروج ہیں۔

تعلیم یا فن	اسلامی اصطلاح یا لفظ	اروپائی اصطلاح یا لفظ (ہسپانی، انگریزی، لاطینی وغیرہ)
طب سائنس	قرنبیق	Alembic
تجارت	کافور	Comphor
"	صندل	Sandal
"	عنبر	Amber
"	مشک	Musk
"	قلنج	Colic
"	مالیخولیا	Melaucholia
"	القلی	Alkali
"	زعفران	Saffron
"	خولنجاں	Galango
"	آرنج	Orange
"	شربت	Syrup
"	الکحل	Alkohol
"	الکیمیا	Alchemy
"	الاکسیر	Elixir

تعلیم یا فن	اسلامی اصطلاح یا لفظ	اروپائی اصطلاح یا لفظ (ہسپانی، انگریزی، لاطینی وغیرہ)
طب سائنس	تمرہندی	Tamarind
تجارت	لیلنج (پودے کا نام)	Lilac
"	بادزہر (فارسی)	Bezoar
"	اسفنج	Sponge
"	اسفناج	Ispinach
"	فستق	Pistachis
"	شنجرف	Cmnobar
"	جِرم	Germ
"	قرابہ	Carafe
"	مقناطیس	Magnatism
"	زنجبیل	Ginger
"	یشب	Jusper
"	اثمد	Antimony.

غرض خطۂ یورپ میں عربی یا اسلامی سائنس و طب کی حیات و ممات کی یہ داستان جو مختصراً تاریخی و تدریجی ارتقا کے ساتھ آپکے سامنے پیش ہو چکی۔ ایشیا میں ابھی تک زندہ ہے۔ اور مراکو سے لیکر ہندوستان تک کوئی اسلامی دواخانہ ایسا نہ ہوگا جہاں کہ قرابادین اور محیطِ اعظم شرحِ اسباب و قانون و شفا وغیرہ کے اصول پر عملدرآمد نہ ہوتا ہو۔ خیر۔ خلاصہ کے طور پر یہ بھی سمجھ لینا چاہئیے کہ اسلامی طب و سائنس کا آغاز سنہ ۷۵۰ء دورِ تراجمہ سنہ ۸۵۰ء سے سنہ ۹۰۰ء تک اور زمانہ شباب سنہ ۹۰۰ء سے سنہ ۱۱۰۰ء تک اور زوال سنہ ۱۱۰۰ء کے بعد سے مورخین نے تسلیم کیا ہے۔ اَب ہم مشہور مستشرق میکس مُیرہوف کے بیان پر اپنے تاریخی مقالہ کو ختم کرتے ہیں۔ آپ صفحہ ۳۵۴ پر اس طرح رقمطراز ہیں۔

"اگر ہم اسلام کی طبی سائنس پر نظر ڈالیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک آفتاب درخشاں تھا۔ جس پر اولاً یونانی اثرات کا گہن لگا۔ پھر اسکی تیز روشنی بلحاظ تاثیر چاندنی کی روشنی کی طرح یورپ کے دورِ متوسط کی اندھیری رات کو چمکاتی رہی۔ پھر یہ چاند اور تارے۔ یورپ کے نشاۃ الثانیہ کے صبح کے وقت ماند نظر آنے لگے۔ لیکن حقیقت یہ ہی کہ تاریکیوں کو مٹانے والے۔ دنیا کو ترقی بخشنے والے یا دنیائے یورپ کے سائنس کے محرک ہی مسلمان تھے۔ اسلئے ہمارا یہ دعوے خوش آیند ہوگا کہ انکی علمی روح انکی معجزانہ اثرات اور نتائج اَب بھی ہمارے ساتھ ہیں۔ اور دوش بدوش مصروفِ عمل ہیں۔"

زجیب و گریبانِ چمن عطر فشاں است ❊ بوئے کہ زما دستِ نسیم سحر افتاد

نکہت شاہجہانپوری

صوبہ بمبئی میں انگریزی علوم کی ابتدا

یوں تو ۳۲۷ قبل مسیح ہی میں سکندر اعظم ہندوستان کی بزم میں مغربی علم و فن کا چراغ روشن کر گیا تھا جو ڈھائی سو سال تک اہل پنجاب اور سندھ کی عقلوں کو ذکاوت کا نور بخشتا رہا۔ اس چراغ سے ہزاروں عقل و خرد کی قندیلیں روشن ہوئیں اور آج بھی ہندی چراغ میں یونانی روغن حکمت کے کچھ قطرے موجود ہیں۔

سنہ ۱۴۹۷ء میں واسکوڈگاما بھی پرتگالی مشعل دانش چمکاتا ہوا کالی کٹ کے ساحل تک پہونچا تھا۔ جسکی روشنی نے وہ آب و تاب دکھائی کہ ۱۵۰۹ء کے اندر ہی تمام ہندوستان کے ساحلی علاقے کو اپنی آغوش میں لے لیا۔ مگر سرزمین مشرق نے ابھی تک انگریزی علوم کے آفتاب کو مغرب کے افق سے طلوع ہوتے نہ دیکھا تھا۔

سنہ ۱۶۰۰ء میں جان نیوبری برطانوی سفیر بن کر دربار اکبری میں حاضر ہوا۔ اور شہنشاہ اکبر کی خدمت میں الزبیتھ ملکہ انگلستان کا مودت نامہ پیش کیا۔ اسے آپ مودت نامہ نہ سمجھئے بلکہ یہ درحقیقت برطانیہ کی طرف سے خراج عقیدت و عظمت تھا جو بہ کمال ادب سلطنت مغلیہ کو پیش کیا گیا تھا

یہ ہندوستان و انگلستان کے مابین تجارتی تعلقات کی ابتدا تھی۔

سر ٹامس رو دوسرا برطانوی سفیر تھا جو دربار جہانگیری میں باریاب ہوا۔ اس نے انگریز سوداگروں کے لئے مزید مراعات لیکر رشتہ اتحاد و موانست ہی مستحکم نہ کیا بلکہ ساحلی مقامات پر تجارتی کوٹھیاں تعمیر کرانے کی اجازت حاصل کر لی اس طرح ملک کے چاروں طرف انگریزوں کے قدم جما دئے۔ شہنشاہ جہانگیر نے ۱۶۲۷ء میں انتقال کیا۔ فی الحقیقت اسی زمانے سے ہندوستان میں یورپی اقوام کا تانتا بندھ گیا۔ پرتگال کے پادری ہندوستان کے ساحلوں پر کھلم کھلا عیسوی مذہب کی تلقین و تبلیغ کرتے پھرتے تھے اور اس صورت سے بالواسطہ مغربی علوم کی اشاعت ہو رہی تھی ۱۷۹۲ء میں صوبہ بنگال انگریز پادریوں کا آماجگاہ بنا۔ انھوں نے ہندوستان کے مشرق میں انگریزی علوم پھیلانے شروع کئے۔ مگر مغربی سواحل پر ۱۸۱۰ء سے قبل اُن کا ورود نہ ہو سکا۔ انگریز پادریوں کی آمد نے امریکن مشن کے دل میں ہندوستان آنے کا ولولہ پیدا کیا تاکہ انگریزی علوم و فنون کے پردے میں دین عیسوی کی تبلیغ بھی ہوتی رہے۔ مگر اس زمانہ میں امریکہ و برطانیہ برسر پیکار تھے۔ امریکہ میں جنگ آزادی کے شعلے بھڑک رہے تھے۔ جو انگریزوں کے دلوں کو جلا کر خاک کئے دیتے تھے۔ ایسی حالت میں امریکن مشن کا ہندوستان آنا آسان نہ تھا۔ مگر مذہب کے نام سے تیر چلایا گیا تھا کیونکر خطا جاتا۔ سر ایون نیپئن گورنر بمبئی نے ۱۸۱۳ء میں امریکن پادریوں کو اپنے صوبہ میں داخل ہونے کی اجازت دیدی۔ درحقیقت

انگریزی علوم کی داغ بیل صوبہ بمبئی میں ۱۸۱۳ء ہی سے پڑی۔ یہ امریکن پادری بل اور لنکاسٹر کی مروجہ تعلیم سے استفادہ کر کے بمبئی آئے تھے انکی دیکھا دیکھی کچھ مدت بعد کلیسائے انگلستان کے پادری مغربی اصول و طریقۂ تعلیم سے آراستہ ہو کر ہندوستان کے مغربی ساحل پر آنے لگے اور یہاں کے باشندوں کو نئے طریقوں سے انگریزی زبان سکھانے کا اہتمام ہونے لگا۔

اس میں کلام نہیں کہ پادریوں کی تعلیمی جد و جہد میں مذہبی جذبہ کارفرما تھا۔ مگر ہندوستان کی سیاسی تنظیم اور ملک گیری کی مصلحتیں بھی اس امر کی متقاضی تھیں کہ مفتوحہ ہندوستانی کے دل و دماغ کو مغربی علوم کی روشنی سے کچھ ایسا چمکایا جائے کہ اس کی نگاہ بصیرت خیرہ ہو جائے۔ اور اسے اپنی پرانی تہذیب کی بہار دھندلی نظر آنے لگے۔

یہی وجہ تھی کہ اب یہ مسئلہ کمپنی کے اعلیٰ حکام کے دماغوں میں جگہ پانے لگا۔ رفتہ رفتہ مجالس منتظمین یعنی کورٹ آف ڈائریکٹرس کے خیالات کا مرکز بھی یہ قرار پایا کہ ہندوستانی رعایا کو انگریزی علوم و تمدن سے واقف کیا جائے تاکہ وہ بتدریج یا ان کی آئندہ نسلیں مغربی رنگ میں رنگ جائیں۔ ان خیالات نے عملی شکل اختیار کی چنانچہ تھوڑی مدت بعد انگریز پادریوں کی قیادت میں انجمن تعلیم کی بنیاد پڑی جس کا نام بمبئی ایجوکیشن سوسائٹی قرار پایا جس کی تفصیل آئندہ آئے گی۔

یہ وہی زمانہ تھا جب مرہٹہ اپنی رہی سہی عظمت و پیشوائی کھڑکی کے میدان میں دفن کر کے بھاگ گئے تھے اور انگریزوں کو احاطہ بمبئی کا بیشتر حصہ

"بلا شرکت غیری" سونپ گئے تھے۔ کونکن۔ گجرات اور دکن پر بھی انگریزی اقتدار قائم ہو چکا تھا۔ مگر مجھے تاریخی واقعات میں نہ اُلجھنا چاہیئے ورنہ اصل مبحث سے دُور ہو جاؤنگا۔ مجھے یہ کہنا تھا کہ ۱۷۹۰ء سے پہلے ان اطراف میں کوئی باقاعدہ تعلیمی نظام نہ تھا۔ بعض دیہات میں دیسی بانوں کی تعلیم برہمن اُلٹی سیدھی دیدیا کرتے تھے۔ ۱۸۰۰ء کے آغاز میں رومن کیتھولک لوگوں کے گرجے تعمیر ہونے لگے جنکے احاطوں میں اسکول بھی بنائے جاتے تھے اور ان میں مغربی علوم کی تعلیم دی جاتی تھی۔

۱۷۹۰ء میں سر چارلس گرانٹ کمپنی کی خدمات سے سبکدوش ہوکر انگلستان واپس گیا وہاں جاکر دارالعوام کا رکن بنگیا۔ اور خاص ناموری حاصل کرلی۔ اس نے اہل انگلستان کو اس حقیقت سے آگاہ کیا کہ ہندوستان میں جو سماجی ابتری اور باہمی افتراق ہے وہ محض جہالت کے سبب سے ہے اور اس کا واحد علاج تعلیم ہے۔ نفس تعلیم کی اہمیت تو سب کو تسلیم تھی مگر سوال یہ تھا کہ ذریعہ تعلیم انگریزی زبان ہو یا ملکی۔ اس مسئلہ میں وہ انگریز میکالے کا ہم خیال نکلا اس نے پر زور مطالبہ کیا کہ علم طبیعات۔ فلسفہ۔ دینیات۔ اور بعض فنون کی تعلیم انگریزی زبان ہی میں دی جائے۔ اس مسئلہ کو یہیں چھوڑیئے۔ اب ذرا ڈاکٹر بل کے طریقہ تعلیم کا حال سُن لیجئے۔ جسکی ابتداء ہندوستان ہی سے ہوئی تھی اور یہاں کے انگریزی اسکولوں میں ابتدً اسی طریق سے تعلیم دیجاتی تھی۔ ڈاکٹر اینڈرو بل ۱۷۸۹ء سے ۱۷۹۶ء تک مدراس کے یتیم خانے میں سپرنٹنڈنٹ کے عہدے پر مامور تھے

ایک انگریزی اسکول بھی اس یتیم خانے سے ملحق تھا جب اس اسکول میں معلمین کی تعداد کم ہوگئی۔ ڈاکٹر بل نے بڑی عمر کے طالب علموں سے معلمونکا کام لیا۔ ان طلباء نے چھوٹی عمر کے بچوں کو اس عمدگی سے پڑھایا کہ ڈاکٹر مذکور نے انگلستان پہونچ کر اپنے اس طریقہ تعلیم کے متعلق ایک رسالہ چھپوایا۔ یہ طریقہ تعلیم انگلستان و امریکہ تک مقبول ہوا۔ ۱۷۹۸ء میں جوزف لنکاسٹر نے بھی قریب قریب یہی طریقہ تعلیم ایجاد کیا تھا۔ وہ بھی اپنے اسکولوں میں اعلیٰ جماعتوں کے طلاب سے ادنیٰ جماعتوں کے بچوں کو تعلیم دلایا کرتا تھا۔ اور ریت پر حروف تہجی کی مشق کراتا تھا۔ لنکاسٹر کی ہم خیال جماعت نے رفتہ رفتہ ۱۸۰۸ء میں ایک تعلیمی انجمن قائم کی جو لندن میں برٹش اینڈ فارن سوسائٹی کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس سوسائٹی کی جدّ وجہد سے انگلستان و نیز بیرونی ممالک میں انگریزی تعلیم کو بہت فروغ ہوا۔ مگر ڈاکٹر بل کے مقلدین کب چین سے بیٹھ سکتے تھے۔ انہوں نے ۱۸۱۱ء میں دوسری انجمن کی طرح ڈالی۔ یہ اول الذکر سوسائٹی کی حریف تھی۔ ان دونوں تعلیمی انجمنوں کی رقابت نے انگلستان میں عام طور پر تعلیمی روح پھونکدی۔ اور ایسے ایسے پُرجوش افراد پیدا کئے جنھوں نے ہندوستان آکر انگریزی تعلیم کا بیج بویا۔ اور رفتہ رفتہ یہ زمین اسے راس آگئی۔

۱۸۱۱ء سے ۱۸۱۵ء تک گورنر جنرلوں نے ہندوستان میں انگریزی تعلیم کی نشر و اشاعت کے مسئلہ پر خاص توجہ کی ہے اور اسی زمانے میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے دیگر حکام نے بھی یہاں انگریزی تعلیم کی ترویج کے لئے جو کوششیں

کی ہیں وہ ہر طرح قابل لحاظ ہیں۔ ۱۸۱۱ء میں لارڈ منٹو نے تعلیمی انحطاط کو مدنظر رکھتے ہوئے سفارش کی تھی کہ اعلیٰ دانشگاہوں کے لئے مزید رقم منظور کی جائے۔ ۱۸۱۳ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ارباب بست وکشاد نے ہندوستان میں انگریزی تعلیم اور علم طبعیات کو رواج دینے کے لئے مدِ تعلیم میں ایک لاکھ روپیہ سالانہ کا اضافہ کیا تھا۔ مارکوئیس آف ہیسٹنگز کا وہ مراسلہ بھی ہندوستان کی تعلیمی تاریخ میں ضرور اہمیت رکھتا ہے۔ جو انہوں نے ماہ اکتوبر ۱۸۱۵ء کو حکومت کی خدمت میں بھیجا تھا جس میں ہندوستان کے باشندوں کو اعلیٰ تعلیم دلانے کی سفارش کی گئی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ ان مبارک تحریکوں سے تمام ہندوستان متاثر ہوا۔ مگر صوبہ جات بنگال و مدراس کو استفادہ حاصل کرنے کے زیادہ مواقع ملے بمبئی اور اس کے ملحق مغربی سواحل اپنے بُعد کے سبب زیادہ فائدہ نہ اٹھا سکے

بمبئی کی تاریخ میں ۲۹ جنوری ۱۸۱۵ء یاد رکھنے کے قابل ہے جس دن سینٹ تھامس چرچ کی عمارت میں باشندگان بمبئی کا ایک جلسہ منعقد ہوا تھا اس جلسہ میں یہ قرار پایا تھا کہ غربا میں مذہبی تعلیم پھیلائی جائے اور چیریٹی اسکول کو ترقی دیجائے۔ جو بہت کس مپرسی کی حالت میں تھا۔ اس تحریک کی ابتدا بمبئی بائیبل سوسائٹی کیطرف سے ہوئی تھی اور اسی دن سے بمبئی ایجوکیشن سوسائٹی عالم وجود میں آئی۔ اس سوسائٹی کی اہمیت ظاہر کرنے کے لئے یہ عرض کردینا کافی ہے کہ سر ایون نے پئن گورنر بمبئی اس کے صدر تھے۔ یکم جولائی ۱۸۱۵ء کو اس سوسائٹی کیطرف سے

ایک انگریزی اسکول جاری ہوا جس میں ابتداً ۳۷ طلبا تعلیم پاتے تھے ان میں صرف ۳ ہندوستانی تھے۔ اس سوسائٹی نے جیرٹی اسکول کو بھی اپنی نگرانی میں لے لیا۔ اور طلبا کے قیام کے لئے گرجے کے قریب ایک دارالاقامت تعمیر کرادی۔ اس سوسائٹی کے اسکولوں میں ڈاکٹر بل کا طریقہ تعلیم رائج تھا بمبئی ایجوکیشن سوسائٹی نے جو سالانہ رپوٹیں مرتب کی ہیں ان کے مطالعہ سے اس زمانے کے انگریزی مدارس کی کیفیت۔ طریقہ تعلیم، نظم ونسق اور دیگر دلچسپ حالات معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ انگریزی مدارس میں ہندوستانی دستور کے مطابق کام ہوتا تھا مگر وہ طریقہ تعلیم، ضبط اور پابندی اوقات میں برطانوی اسکولوں کی طرح تھے کمزور طالب علموں کو ہوشیار طلبا پڑھاتے تھے، ہوشیار طلبا کی تعلیم کے لئے معلم نوکر تھے جو وقتاً فوقتاً کمزور طلبا کی دیکھ بھال بھی کرتے تھے۔ لکھنے اور پڑھنے کی مشق ایک ساتھ کرائی جاتی تھی۔ عموماً لکڑی کے تختوں، ریت کی سطح یا کمروں کے فرش پر لکھنا سکھایا جاتا تھا۔ اس ترقی یافتہ زمانہ میں یہ طریقہ تعلیم مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے۔ مگر اس زمانہ کا خیال کرتے ہوئے جب انگریزی داں معلم ناپید تھے اور ملک کے باشندوں کو جلد سے جلد تعلیم یافتہ بنانا مقصود تھا اس سے بہتر طریقہ کار نہ تھا۔

دراصل بمبئی ایجوکیشن سوسائٹی کے قیام کی غرض وغایت تو صرف یہی تھی کہ غریب برطانوی و نیم برطانوی (یعنی یورپے شیئن) قوم کے بچوں کو انگریزی سکھانے میں مدد دے اور سرکاری عہدہ داران اور عیسائی یتیم بچوں کو

اُن پر ترجیح دے کیونکہ سوسائٹی مذکور نادار طلبا کو فنِ تجارت سکھا کر کسبِ معیشت
کے قابل بنا دیا کرتی تھی اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس
سوسائٹی نے اپنے اسکولوں میں غیر عیسائی بچوں کی تعداد بڑھانے میں کوئی عملی
سرگرمی نہیں دکھائی مگر بایں ہمہ ان اسکولوں میں کچھ نہ کچھ غیر عیسائی بچے
بھی ضرور تعلیم پاتے رہے گو انہیں پوری فیس ادا کرنی پڑتی تھی مگر شکر ہے کہ
ان کو عیسوی تعلیم حاصل کرنے پر مجبور نہیں کیا گیا۔

۱۸۱۷ء میں جب بمبئی ایجوکیشن سوسائٹی کے سرمایہ میں معتد بہ اضافہ
ہوا تو اس نے اپنا دائرہ عمل بھی وسیع کر دیا۔ سورت۔ اور تھانے میں انگریزی
اسکول جاری کئے گئے۔ ۱۸۲۰ء میں ایک اسکول بھروچ میں بھی کھولدیا گیا
ان اسکولوں میں غیر عیسائی طلبا کی تعداد نصف تک پہونچ گئی تھی۔

اگست ۱۸۱۸ء میں اس سوسائٹی نے یہ خیال کر کے کہ اب عیسائی بچوں کی
تعلیم کا حسبِ مُراد بندوبست ہو گیا ہے یہ فیصلہ کیا کہ ہندوستانی بچوں کو
بھی انگریزی تعلیم دلائی جائے۔ مگر ہندوستانیوں کی مخالفت کے خوف سے
وہ یکبارگی ایسا کب کر سکتی تھی لہٰذا اس نے سب سے پہلے سربرآوردہ ہندوستانیوں کو
اپنا ہم خیال بنانا شروع کیا پھر دیسی زبانوں میں انگریزی تعلیم کی حمایت میں
رسالے چھپوا کر دیہات و قصبات کی پنچایتوں میں مُفت تقسیم کرائے۔ سوسائٹی
کا یہ مقصد تھا کہ انگریزی زبان کے ساتھ ساتھ دیسی زبانیں بھی سکھائی جائیں
مگر اس زمانے میں قدم قدم پر مشکلات کا سامنا تھا۔ ہوشیار معلم عنقا تھے
مناسب درسی کتب کی کمی تعلیم میں رُکاوٹیں پیدا کرتی تھی۔ مگر رفتہ رفتہ

سب مشکلات آسان ہوگئیں۔ معلموں کو ٹرینڈ کیا جانے لگا۔ کلکتہ اسکول بک سوسائٹی کے ذریعہ درسی کتب منگائی گئیں۔ کچھ کتابیں ہندوستانیوں نے خود تصنیف کیں۔ ایک پارسی ادیب نے مسٹر مرے کی انگریزی گرامر کا گجراتی زبان میں ترجمہ کیا ان کوششوں کا یہ نتیجہ نکلا کہ سنہ ۱۸۱۹ء میں فورٹ۔ مجگاؤں اور گرگام میں باشندگان بمبئی کے بچوں کے لئے تین انگریزی اسکول کھولے گئے۔ صرف فورٹ کے اسکول میں طلبا کی روزانہ اوسط حاضری ۹۰ کے قریب تھی۔ مگر ان سب سکولوں میں زیادہ تر پارسی لوگوں کے بچے تعلیم پاتے تھے سنہ ۱۸۲۰ء میں بمبئی ایجوکیشن سوسائٹی کی بنیادیں بخوبی مستحکم ہوگئیں اسے حکومت کی جانب سے پانچہزار روپیہ کا گرانقدر عطیہ ملا۔ اور مبلغ ۶۰۰ مالللعہ روپیہ ماہانہ کی مستقل امداد منظور کی گئی۔ مالی ترقی کے ساتھ تعلیمی ترقی بھی رونما ہوئی۔ اسکولوں کی تعداد میں نمایاں اضافہ ہوا طلبا کی تعداد بھی روزافزوں ہوتی رہتی۔ سوسائٹی کو اپنی امیدیں بارآور ہوتی نظر آئیں تو اسکے حوصلہ مند اراکین نے ہندوستان میں عام تعلیم و تہذیب پھیلانے کی غرض سے اپنے ماتحت ایک کمیٹی بنائی جس کا نام "نیٹیو اسکول اینڈ اسکول بک کمیٹی" قرار پایا۔ اور یہ طے ہوا کہ اس مقصد کی تکمیل کے لئے سرآوردہ ہندوستانیوں سے چندہ وصول کرکے کافی سرمایہ جمع کیا جائے۔ یہ واقعہ اگست سنہ ۱۸۲۰ء کا ہے مگر افسوس کا مقام ہے کہ اس وقت سوسائٹی کو اپنے منصوبوں میں خاطرخواہ کامیابی نہ ہوئی کیونکہ سوسائٹی مذہب عیسوی کی علم بردار تھی اور ہندوستانیوں کو اس کی طرف سے طرح طرح کی بدگمانیاں پیدا ہوچلی تھیں۔ مرھٹے تو یونہی خلاف تھے

کہ چوتھی لڑائی میں انگریزوں کے ہاتھوں شکست فاش کھا چکے تھے۔ زخم ہزیمت دلوں میں تازہ تھا۔ رہے گجراتی اور مسلمان۔ ان کا یہ خیال تھا کہ بمبئی ایجوکیشن سوسائٹی انگریزی تعلیم کے پردے میں ہماری اولاد کو بے دین کرنا چاہتی ہے۔ غالباً اس موقع پر اس رپورٹ کا اقتباس بے موقع نہ ہوگا جو سوسائٹی کے ہندوستانی رکن مسٹر دیوی داس پرچون داس نے اراکین کے پاس بھیجی تھی۔ اس رپوٹ سے ظاہر ہے کہ باشندگان بمبئی اپنے بچوں کو سوسائٹی کی زیر نگرانی انگریزی تعلیم دلانا نہ چاہتے تھے رپورٹ کا رواں ترجمہ یہ ہے۔

"۲۳ تاریخ سے ہم برابر ان لوگوں کو ترغیب دے رہے ہیں۔ مگر اُن پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ بُلاتے ہیں تو آتے نہیں۔ کہتے ہیں تو سُنتے نہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ خیراتی روپیہ سے بچوں کو پڑھانے سے تو نہ پڑھانا ہی بہتر ہے۔ حضرات اسمیں کلام نہیں کہ ہندوستانیوں کو انگریزی پڑھانے کی تحریک سراسر مفید ہے۔ اور اس میں ان ہی کا بھلا ہے۔ مگر افسوس تو اس بات کا ہے کہ اتنی موٹی بات ان کے دماغ میں نہیں آتی۔ ہم تو اپنے ہندوستانی بھائیوں کے مفاد کی خاطر ہی اس تعلیمی تحریک میں آپ کا ہاتھ بٹانے اُٹھے تھے۔ تاکہ بمبئی کے جزیرے میں مغربی علم کی روشنی پھیلے مگر قصور معاف! ہمیں تو آثار اچھے نظر نہیں آتے۔ لوگوں کی بے اعتنائی دیکھتے ہوئے ہمارا تو یہی خیال ہے کہ خدا ہی ہے جو اس کام میں کامیابی ہو۔ میں اس سلسلہ میں آپ حضرات کو معاہدہ کا واقعہ یاد دلاتا ہوں وہاں مسٹر گوں ڈیلیما نے

پرتگالی بچوں کی تعلیم کے لیئے بڑا روپیہ لگا کر کالج بنوایا اور تعلیم کے اخراجات
کے لیئے خاصا روپیہ بھی جمع کر لیا تھا۔ مگر قسم لے لیجیے کسی پرتگالی بچے نے
اُدھر کا رُخ بھی کیا ہو۔ آج اس کالج کی شکستہ عمارت اپنی ویرانی اور
کس مپرسی پر ماتم کر رہی ہے"

آپ نے غور فرمایا اس رپورٹ کے حرف حرف سے کیسی مایوسی
ٹپکتی ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ ان دنوں بمبئی کے باشندے
انگریزی تعلیم سے بدظن تھے مگر رفتہ رفتہ انگریزی اثر قبول کرتے گئے تھوڑے
دنوں بعد جو ہندوستانیوں نے ایک تعلیمی کمیٹی بنائی جس میں ۳ پارسی
۳ ہندو اور ۳ مسلمان شریک تھے یہ سب ممبر ساکنان بمبئی تھے مسلمان
ممبروں میں قاضی بلدیہ بمبئی قاضی غلام حسین، محمد علی روغے، اور محمد ابراہیم
مقبہ مقابل الذکر ہیں۔ ملا فیروز اور محمد ابراہیم مقبہ وہ علم دوست حضرات
تھے جو آخر دم تک تعلیمی تحریکات میں سرگرمی سے حصہ لیتے رہے۔

بمبئی ایجوکیشن سوسائٹی کی اسکول بُک کمیٹی کے افراد نے انگریزی
درسی کتابوں اور علم ہندسہ کا دیسی زبانوں میں ترجمہ کرایا۔ فلیچر صاحب نے
لنکاسٹری طریقہ تعلیم کا خاکہ مرتب کر کے اس کا گجراتی زبان میں ترجمہ کرایا۔
سوسائٹی کے سنٹرل اسکول میں گجراتی داں معلموں کو ٹرینڈ کیا جانے لگا۔ ۱۸۲۱ء
میں فورٹ میں ایک اور گجراتی اسکول جاری ہوا جس میں بل کے طریقہ تعلیم پر
درس دیا جاتا تھا۔ درسی کتابوں کے سلسلہ میں کلکتہ بُک سوسائٹی سے ادبی
امداد طلب کی گئی۔ ماؤنٹ اسٹوارٹ الفنسٹن گورنر بمبئی نے انگلستان سے

جدید مرہٹی ٹائپ منگوایا۔ جس نے مرہٹی علم ادب میں نئی روح پھونکدی تصنیف و تالیف کا دروازہ کھل گیا۔ مئی ۱۸۲۱ء میں لندن میں برٹش انڈیا سوسائٹی کی بنیاد پڑی جس نے اہل ہند کی تعلیمی و اخلاقی ترقی کی تحریکوں کا خیر مقدم کیا اور درسگاہوں کی اعانت کی۔

اب ذرا بمبئی نیٹو ایجوکیشن سوسائٹی کے اغراض و مقاصد بھی سن لیجئے۔ یہی سوسائٹی کچھ دنوں بعد نیٹو اسکول اینڈ سکول بک سوسائٹی کے نام سے مشہور ہوئی جس کی کارگزاریاں اوپر بیان ہو چکی ہیں اور کچھ اور بیان کی جائینگی۔ تفصیل اغراض و مقاصد حسب ذیل ہے:۔

(۱) بمبئی اور مضافات میں جدید مدارس کا اجرا (۲) دیسی زبانوں کے ذریعہ اعلیٰ تعلیم کا انتظام (۳) عوام کے مطالبہ اور سوسائٹی کے سرمایہ کے لحاظ سے انگریزی تعلیم کی ترویج (۴) دیسی مدارس کی اصلاح و ترقی — (۵) اسکولوں کے لئے ضروری سامان اور انگریزی کتب کی فراہمی (۶) بلحاظ سرمایہ اہل ہند کے لئے مناسب طریقہ تعلیم کی ترویج (۷) معلموں کو ٹرینڈ کرانا (۸) مندرجہ بالا مقاصد کی تکمیل کے لئے سرمایہ کی فراہمی۔

سوسائٹی کے فرایض کی انجام دہی مجلس منتظمہ کے سپرد تھی جس میں ۱۲ یوروپین اور ۱۲ ہندوستانی اراکین تھے سکریٹری کی خدمت ہندوستانی کو تفویض تھی۔ سوسائٹی کو گورنر بمبئی کی صدارت کا شرف حاصل تھا۔ اس کے ممبروں میں عموماً سرکاری حکام بھی ہوا کرتے تھے۔ چار سب کمیٹیاں تھیں ہر سب کمیٹی کے ذمہ مختلف فرائض تھے۔ کسی کے سپرد شعبۂ تصنیف و تالیف

طباعت تھا۔ ہے ذمہ جزیرہ بمبئی و کوکن کے جملہ مدارس کی نگرانی اور ان کے اخراجات کی جانچ پڑتال تھی۔ کوئی مدارس دکن کی نگراں تھی، کوئی مدارس گجرات کی۔

اکثر حکام ضلع بطور نامہ نگار سوسائٹی کو مفصلات کے تعلیمی کوائف بھی رقم کیا کرتے تھے۔ کے علاوہ وہ اپنے خلاصہ شائع ہیں۔ سوسائٹی کے تعلیمی پروپاغنڈے کی اشاعت کیا کرتی تھی۔ کلکتہ کی سکول بک سوسائٹی نے مدراس اور بنگال میں بھی کچھ اسی قسم کا تعلیمی جال پھیلا رکھا تھا اور بمبئی سوسائٹی سے مراسلت جاری رکھتی تھی۔ نیٹو سکول اینڈ بک سوسائٹی نے بمبئی ایجوکیشن سوسائٹی کے چار ورناکیولر سکول واقعہ جزیرہ بمبئی اپنی نگرانی میں چلانے شروع کئے علاوہ ازیں فورٹ میں ایک گجراتی اور ایک مرہٹی اسکول جاری کیا۔ کوکن کے جنوبی علاقے میں بھی ایک اسکول کھولا۔ مرہٹی اسکولوں میں ابتداً شریف لڑکیاں پڑھنے نہ آتی تھیں۔ یکبار غیر متوقع طور پر کچھ مرہٹی لڑکیاں اسکول میں داخل ہوئیں مگر وہ بظاہر شریف خاندان سے نہ تھیں۔ سکریٹری نے اُن کے متعلق تفتیش کی تو معلوم ہوا کہ انھیں لکھا پڑھا کر پیشہ ور بنایا جائیگا لہذا ان طالبات کا نام اسکول سے خارج کر دیا گیا۔ اس موقع پر یہ امر بھی ظاہر کر دینا چاہئے کہ اس زمانے میں صرف شرفا ہی تعلیم کے اہل سمجھے جاتے تھے۔ اہل ہند درکنار شریف انگریز بھی نیچ ذاتوں کو تعلیم دلانا پسند نہ کرتے تھے۔ ایم الفنسٹن صاحب نے خود ایک جگہ یہ جملے رقم فرمائے ہیں "ہمیں نیچ ذاتوں کو علم نہ سکھانا چاہئے کیونکہ اوّل تو اس عمل سے شرفا کا طبقہ ہم سے برگشتہ ہو جائے گا دوم حکومت

بہ لحاظ علم و فضل مجبوراً ایسی ذاتوں کو نوازنا شروع کر دیگی جو شریفوں کی نگاہ میں ذلیل ہیں۔" صاحب موصوف کا یہ خیال تھا کہ ادنے ذاتوں کو تعلیم دیکر اعلیٰ عہدوں پر مامور کر دینے سے لوگوں کی نظروں سے حکومت کا وقار گر جائے گا۔ اس ترقی یافتہ زمانہ میں لوگ اسے تنگ نظری خیال کرینگے۔ میں کیا عرض کر رہا تھا اور کیا معاملہ چھیڑ بیٹھا۔ خیر پھر اپنے اصلی بحث پر آتا ہوں سنہ کلکٹر ضلع اور چند پادریوں کی درخواست پر ۱۸۲۳ء میں مقام پونہ ایک انگریزی اسکول جاری ہوا۔ مگر وہ کامیابی سے نہ چل سکا۔

جس زمانہ کا حال بیان کر رہا ہوں وہ ہندوستان کی تاریخ میں نہایت نازک اور پُر آشوب زمانہ خیال کیا جاتا ہے کیونکہ اس وقت سلطنت مغلیہ دم توڑ رہی تھی۔ مرہٹوں کی قوت جواب دے رہی تھی۔ ملک کا نظام ابتر تھا۔ ہر جگہ طوائف الملوکی کا دور دورہ تھا آپ جانتے ہیں کہ چمنستان علم و فضل جسے ہمیشہ پُر امن فضا کی ضرورت ہے ان حالات میں کب پھول پھل سکتا تھا۔ شمال ہند میں پھر بھی کچھ عربی و فارسی دار العلوم مغلوں کی علم دوستی کی یادگار باقی تھے جو دار السلطنت کی قربت کے سبب جلد فنا نہ ہو سکے مگر احاطہ بمبئی میں مشرقی علوم کا چراغ باد حوادث سے ٹمٹما رہا تھا کہیں کہیں برائے نام مکتبوں کا سلسلہ جاری تھا مگر ان کی تعلیمی حالت پست تھی اگر آپ کو اس زمانہ کی تعلیمی حالت کا صحیح اندازہ لگانا ہو تو بمبئی ایجوکیشن سوسائٹی کی رپورٹ بابت اگست ۱۸۲۱ء مطالعہ فرمائیے جس میں درج ہے کہ "ہر جگہ مکتبوں کی

تعداد کافی ہے مگر ان میں وہ تعلیم نہیں دیجاتی جس پر تعلیم کا اطلاق ہوسکے
بچوں کو حروف شناسی آجاتی ہے اور کچھ معمولی حساب سیکھ جاتے ہیں
پڑھائی کی مشق برائے نام کرائی جاتی ہے۔ صرف ونحو کی طرف مطلق توجہ نہیں
عام معلومات اور اخلاقیات کیطرف سے بے پروائی برتی جاتی ہے"۔
مسٹر چیلین اپنی تعلیمی رپورٹ بابت اگست سنہ ۱۸۲۲ء میں دکن کی درسگاہوں
کا یوں خاکہ کھینچتے ہیں "دکن کی سرزمین میں مکتبوں اور درسگاہوں کی
بہتات ہے۔ قریہ قریہ مدرسوں سے بھرا ہوا ہے۔ پوناہی کو لیجئے جہاں
خدا جھوٹ نہ بلائے تو ۶۰ - ۷۰ ایسے معلّم ہیں جو دس سے لیکر پچاس
طلباء کو یومیہ مرہٹی زبان پڑھاتے ہیں۔ اس شہر میں مرہٹی کے سوا کسی دوسری
زبان کا چرچا ہی نہیں۔ پڑھنے کو تو نجار۔ سنار۔ خیاط۔ نور باف اور گوسائیں
بھی کچھ لے دیکر پڑھ جاتے ہیں۔ مگر تعلیم جس کا نام ہے وہ صرف اونچی ذاتوں ہی کو
دی جاتی ہے۔ مدارس میں برہمن لڑکوں کی تعداد غالب ہے۔ پڑھائی کا حال
نہ پوچھئے صرف چند مذہبی حکایات ازبر کرائی جاتی ہیں آٹھ برس کے بچے پڑھنے
آتے ہیں چودہ ۱۴ برس کے ہوئے کہ انہیں مکتب سے نکال کاروبار میں لگا دیا۔ تعلیم کا
خرچ بھی برائے نام ہی ہے۔ اور درحقیقت جیسی تعلیم ہے ایسا ہی اس کا خرچ
بھی ہے۔ ایسی تعلیم پر زیادہ خرچ کرنا دانشمندی کے خلاف ہے۔ عموماً ہر طالب علم
چار آنے ماہوار بطور فیس ادا کرتا ہے۔ مگر کبھی کبھی معلم کی دعوت بھی کی جاتی ہے
ہر مہینے دو دن تعطیل رہتی ہے اُن ایام میں ہر طالب علم پاؤ بھر چاول اور
ایک پیسہ معلم کی نذر کرتا ہے۔ اوقات تعلیم ۶ بجے صبح سے ۱۰ - ۱۱ بجے تک

پھر ۱ بجے سے ۵ بجے شام تک مقرر ہیں۔ معززین کی اولاد گھروں پر تعلیم پاتی ہے اور ان کے معلم بھی مخصوص ہوتے ہیں؎

سورت اور گجرات کی تعلیمی کیفیت معلوم کرنی ہو تو مسٹر رومر کا بیان سنئے جو انہوں نے ۱۸۲۲ء میں رقم فرمایا تھا۔ یہ وہی انگریز ہیں جو ۱۸۳۱ء میں بمبئی کے قائمقام گورنر رہ چکے ہیں۔ فرماتے ہیں " گجرات کے مدرسوں کی حالت ناگفتہ بہ ہے حروف تہجی سکھانے سے پہلے ہی پہاڑے اور اعداد سکھا دئے جاتے ہیں۔ حساب دانی کا یہ عالم ہے کہ جمع تفریق و تقسیم کو علم ہندسہ کی منتہیٰ سمجھا جاتا ہے۔ پڑھائی کا حال نہ پوچھئے جب بچہ اس قابل ہوا کہ بہی کھاتہ لکھ پڑھ سکے اسے مکتب سے نکال جھٹ کسی مہاجن کے ہاں امیدوار کر دیا جاتا ہے۔ یا کسی گماشتے کے ساتھ لگا دیا جاتا ہے۔ صرف بڑے قصبوں ہی میں مکتب ہیں۔ کسی کسی گاؤں میں بھی ان کا وجود ہے۔ مگر اکثر مقامات بالکل کورے ہیں۔ ان اطراف میں یہ دستور ہے۔ کہ معلم مہینے دو مہینے کے لئے گاؤں گاؤں دورہ کرتا ہے۔ معلم کسی گاؤں میں آیا تو برہمن۔ بقال پٹیل اور اونچ ذات کے لوگوں نے اپنی اولاد اسکے سپرد کر دی وہ انہیں مہینے دو مہینے لکھا پڑھا کر چلتا بنا۔ آپ تعلیم کے اخراجات سنیں تو حیران رہ جائیں ہر طالب علم کو صرف ۲؍ ماہوار دینا پڑتا ہے وہ بھی نقدی کی صورت میں نہیں بلکہ بشکل غلہ۔ صرف مسلمان گھرانوں میں قابل معلموں اور فاضل منشیوں کے ذریعہ فارسی کی اعلیٰ تعلیم دلائی جاتی ہے سورت میں بوھرہ فرقہ کا ایک شاندار دار العلوم ہے جس میں سو طلبا سے زائد عربی تعلیم پاتے ہیں اس دار العلوم میں عربی صرف و نحو فقہ و الہیات کے علوم بہترین

طریقے سے پڑھائے جاتے ہیں۔ اس شہر میں ساٹھ ستر ایسے مدرسے بھی میں جنمیں برھمن پنڈت تعلیم دیتے ہیں۔ ان مدارس میں کسی زمانے میں چار ہزار طلبا پڑھا کرتے تھے"۔

سرکاری مراسلات اور حکام ضلع کی تحریروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۸۲۵ء میں صوبہ بمبئی میں ۱۶۰۰ مکتب و مدارس تھے جن میں ۲۶۵۰۰ طلبا تعلیم پاتے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس تعلیمی ترقی کا سہرہ بمبئی ایجوکیشن سوسائٹی کے سر ہے جس نے اپنی کمیٹی کے ذریعہ یہاں اعلے تعلیمی خدمات انجام دی ہیں۔

اَب میں اس صوبہ کی مروجہ زبانوں کے متعلق کچھ عرض کرونگا۔ ظاہر ہے کہ یہاں ابتدا ہی سے مرہٹی اور گجراتی زبانوں کو عروج حاصل ہے اس لئے اسکولوں میں انگریزی زبان کے علاوہ یہی زبانیں سکھائی جاتی تھیں۔ مگر وقت یہ تھی کہ یہ دونوں زبانیں ادبی زبان بننے کی صلاحیت نہ رکھتی تھیں اگر آپ ان زبانوں کی ابتدائی تاریخ ملاحظہ فرمائیں تو میری طرح اسی نتیجہ پر پہونچیں گے کہ دراصل یہ زبانیں معمولی بات چیت اور تجارتی کاروبار کے لئے وضع کی گئی تھیں مگر اب ان کو وسعت دینے اور باقاعدہ زبان بنانے کی ضرورت پیش آئی۔ بمبئی ایجوکیشن سوسائٹی کی مجلس منتظمہ نے اپنی رپورٹ میں صاف لکھا ہے کہ "مرہٹی اور [illegible] اور بطور روزمرہ استعمال کے قابل ہیں اِن دونوں کو ابھی تک ادبی دنیا میں روشناس ہونے کا موقع نہیں ملا۔" اور واقعی یہ دونوں زبانیں تھیں بھی اسقدر تہی دست کہ اپنی ٹکسال سے حسب ولخواہ

الفاظ کے سکّے پیدا نہ کر سکتی تھیں۔ عوام اس حقیقت سے آشنا نہیں کہ ابتداً
انگریزوں ہی نے ان زبانوں کی لغت کو وسیع کرانے اور انہیں اعلیٰ پایہ کی
تصنیف و تالیف و طباعت کا کام اپنے ذمہ لیا تھا۔ اگر حکومت کی سرپرستی
کا ہاتھ ان پر نہ ہوتا تو آج یہ بھی سنسکرت کیطرح مردہ ہو جاتیں اور پنجابی
اور بلوچی زبانوں کی طرح حلق کے اندر ہی سنائی دیتیں سطح قرطاس پر
نظر نہ آتیں۔

یہ تو عرض کیا جا چکا ہے کہ سب سے پہلے مرہٹی ٹائپ الفنسٹن صاحب گورنر بمبئی
نے انگلستان سے بنوا کر منگوایا تھا جس سے مرہٹی طباعت کو چار چاند لگ گئے
اب یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ بمبئی ایجوکیشن سوسائیٹی کی کوششوں سے
مرہٹی اور گجراتی زبانوں کو صرف و نحو کے قالب میں ڈھال کر اصول زبان بنایا
گیا وسعت دینے کے لئے اکثر سنسکرت اور موقع بہ موقع عربی فارسی الفاظ
شامل کئے گئے۔ سنسکرت سے تو ان زبانوں کا آبائی رشتہ تھا ہی مگر انہوں نے
عربی فارسی لفظوں کو بھی ایسا اپنایا کہ وہ اپنی وضع قطع سے ہندی نژاد معلوم
ہونے لگے۔ مثلاً گجراتی زبان میں تپاسنا اسم مصدر ہے جو تحقیق و تفتیش
معائنہ و جستجو، ملاحظہ و تلاش، دیکھ بھال جانچ پڑتال کرنے کے مفہوم میں آتا ہے
لغت کی کم مائیگی نے ایک ایک مصدر سے کیا کیا معنی نکالے ہیں اگر اس کی
اصلیت کا سراغ لگائیں تو تپاس سے مشتق ہے جس کی اصل تلاش یا تفحص ہے
اس قسم کے ایک دو نہیں سینکڑوں الفاظ ہیں جنہوں نے مرہٹی اور گجراتی زبانوں
پر چڑھ کر وہ روپ بدلا ہے کہ علم اللسان کا محقق انھیں دیکھ کر دنگ رہ جاتا ہے

مگر یہاں یہ مسئلہ خارج از بحث ہے مجھے تو صرف یہ دکھانا مقصود تھا کہ گجراتی
اور مرہٹی علم ادب کی عمریں کچھ ایسی زیادہ نہیں اور ان زبانوں کی ترقی زیادہ تر
انگریزوں کی شرمندہ احسان ہے۔ یہ سچ ہے کہ ہندوستانی پراکرتوں میں عربی
وفارسی الفاظ کی آمیزش مسلمان بادشاہوں کے زمانے ہی سے شروع ہوگئی
تھی مگر پھر بھی ان میں سے کسی زبان نے مستقل ادبی حیثیت اختیار نہ کی تھی
بات یہ تھی کہ فارسی کے حسن دلکش کے مقابلہ میں ان زبانوں کی ملاحت
قابل التفات نہ تھی البتہ محفلوں میں کبھی کبھی ہندی بھاکا کے اشعار ضرور
دلوں کو لبھالیا کرتے تھے۔ خیر اس مسئلہ کو جانے دیجئے اب مرہٹی اور گجراتی زبانوں
پر انگریزوں کے احسانات سُنیئے۔ ان زبانوں میں ادب کی ابتدائی کتابیں تصنیف
کرنے کے لئے انگریزوں نے مصنفین کی ہر طرح حوصلہ افزائی کی۔ انعامات دینے
کا اعلان ہوا۔ مترجموں کو مالی امداد ملی جب ٹائپ کے حروف ترتیب دینے میں
مشکلیں پیش آئیں اور طباعت کے اصراف بڑھنے لگے تو سہولت و کفایت کے
خیال سے پتھر پر چھپائی کا انتظام ہوا۔ ولایت سے لیتھو کی مشین منگوائی
گئی غرض ایجوکیشن سوسائٹی نے جس کو براہ راست حکومت کی اعانت و
حمایت حاصل تھی مرہٹی اور گجراتی زبانوں کو صوبہ بمبئی میں طفل شیرخوار کی طرح بڑے
لاڈ سے پالا اور قدم قدم پر دستگیری کی۔ پرانے طریقوں کو بدل کر بل اور لنکاسٹر
کے طریقہ تعلیم جاری کئے۔ مدارس کی اصلاح کی۔ اس خیال سے کہ کہیں انگریزی
میں پڑ کر بچے اپنی مادری زبان فراموش نہ کردیں یہ طے کیا کہ انگریزی اسکولوں میں
داخل ہونے سے قبل کچھ دنوں گجراتی اور مرہٹی مدارس میں تعلیم دلائی جائے۔ یہ

سرگرمیاں یہیں تک ختم نہ ہوئیں بلکہ مفید تعلیم دینے کے لئے قابل معلموں کی ضرورت پیش آئی۔ قابل معلم بنانے کے لئے اعلیٰ نصاب تعلیم بھی درکار تھا لہٰذا صرف کثیر سے مفید کتب کا سرمایہ جمع کیا گیا معلمین کو وظائف دے کر ٹرینڈ کیا گیا۔ مدارس کی نگرانی واصلاح کے لئے جا بجا سپرنٹنڈنٹ مقرر کئے گئے جن میں دو بمشاہرہ یکصد ماہوار جزیرہ بمبئی و سالسٹ کے لئے تھے۔ پونہ دھلیا۔ سورت۔ اور احمد آباد کے مدارس کے لئے بمشاہرہ ۵۶ ماہوار سپرنٹنڈنٹوں کا تقرر ہوا۔ یہ جملہ سپرنٹنڈنٹ بمبئی ایجوکیشن سوسائٹی کے انگریز اور ہندوستانی سکرٹریوں کے تحت کام کرتے تھے۔ دکن کے مدارس کا انتظام بھی اسی طرح ہوتا تھا۔ غرض اس سلسلہ میں مبلغ ۷۶۰ روپیہ ماہوار کا خرچ تھا سرمایہ کی کمی حکومت بمبئی پوری کرتی رہتی تھی یعنی عطیات و مستقل ماہانہ امداد کے علاوہ حکومت کی طرف سے وقتاً فوقتاً مالی امداد بھی ملتی تھی۔ یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ ایجوکیشن سوسائٹی نیم سرکاری جماعت تھی جس کے ہر عمل میں حکومت کا ہاتھ کارفرما تھا۔

داستان اعانت وحمایت طویل ہے۔ مگر مختصراً اتنا عرض کردوں کہ ہمیں ۱۸۲۳ء سے سوسائٹی کی جملہ مطبوعات کا خرچ حکومت بمبئی نے اپنے ذمہ لے لیا تھا۔ ۱۸۲۴ء میں اس نے لیتھو مشین فراہم کرنے اور مطبع کے جملہ مصارف خود برداشت کرنے کا وعدہ کرلیا تھا۔ سوسائٹی نے بلدہ بمبئی میں جہاں جہاں کتب خانے قائم کئے تھے اور جن مکانات میں اس کی جانب سے مختلف تعلیمی جلسے منعقد ہوتے تھے۔ ان سب کا کرایہ حکومت بمبئی ادا کرتی تھی۔ جملہ سپرنٹنڈنٹ اور معلمین کی تنخواہیں اور دیگر مصارف کتب بھی گورنمنٹ ہی کے ذمہ تھے۔ ان مستقل

اخراجات کے علاوہ حکومت بمبئی نے اپنے اثر سے شہروں میں جابجا انگریزی سکول
کھلوائے تھے۔ ان اسکولوں میں طلبا کی تعداد قابلیت اور کامیابی کے لحاظ سے
مستحق متعلمین کو انعامات دئے جاتے تھے۔ غرض عوام کو ہر ممکن طریقہ سے تعلیم کا
شوق دلایا جاتا اور دیسی زبانوں میں ادبی۔ اخلاقی اور سائنٹفک مباحث پر
عمدہ مضامین لکھنے والوں کو انعام تقسیم کئے جاتے تھے۔ یہ سب حوصلہ افزائیاں
حکومت ہی کی طرف سے تھیں۔

گورنر بمبئی کے تعلیمی شغف کا یہ عالم تھا کہ انھوں نے ۱۸۲۴ء میں اپنے
صوبہ کے تمام کلکٹروں کو ہدایت کی تھی کہ اپنے اپنے ضلع کی تعلیمی ترقی کا حال
لکھکر بھیجیں۔ حکومت کی یہ تمام کوششیں بار آور ہوئیں۔ صوبے کے مختلف شہروں
میں انگریزی تعلیم جاری ہوگئی اور باشندے مغربی تہذیب و تمدن سے متاثر ہونے لگے۔

حضرات! پچھلے اوراق میں بمبئی ایجوکیشن سوسائٹی کی تعلیمی سرگرمیوں کے
متعلق اپنی روشنی ڈال چکا ہوں مگر دیکھتا ہوں کہ اس کے علمی کارناموں کی بحث
کچھ تشنہ رہ گئی۔ درحقیقت اس سوسائٹی کے کارنامے ایسے نہیں جو اس مختصر صحبت
میں بالتفصیل بیان ہو سکیں۔ حیران ہوں کہ کیا کیا لکھوں، مجملاً کیا کیا بتاؤں، دریا
کو کوزے میں کیسے سماؤں۔ علم دوستی کا ثبوت اس سے بڑھکر کیا ہوگا کہ اس
سوسائٹی نے اپنی جدوجہد سے مرہٹی۔ گجراتی۔ اردو۔ اور کناری زبانوں کی
بہترین کتب نصاب تعلیم تصنیف کرائیں۔ ابتدائی درسی کتب کے لئے مبلغ ایکسو
سے چار سو روپیہ تک انعام مقرر کیا اور اعلیٰ معیار کی کتب کا حق تصنیف مبلغ
چار ہزار سے پانچ ہزار روپیہ تک قرار پایا۔ اسکے علاوہ انگریزی درسی کتب

انگریزی علم ہندسہ، صرف و نحو، تاریخ، اخلاق، طبیعات و ریاضی کی کتب کے مختلف دیسی زبانوں میں بامحاورہ ترجمے کرائے۔ اخلاقی حکایات و مفید اقوال جمع کئے اور انہیں بطور نصاب مدارس میں جاری کیا۔ ادب نوازی کا ثبوت اس سے بڑھ کر کیا ہوگا کہ لغت کی تالیف وطباعت کا کام اپنے ذمہ لیا۔ مگر یہ معمولی کام نہ تھا۔ صرف مرہٹی ڈکشنری مصنفہ مسٹر مولیس ورتھ کی تالیف طباعت ہی میں مبلغ ۱۷،۳۴۸ روپیہ صرف ہوا تھا اس نادر لغت کی قیمت ۹۳ روپیہ مقرر کی گئی تھی۔ اسی طرح سوسائٹی نے تاریخ مرہٹہ مصنفہ گرانٹ ڈف اور تاریخ فرشتہ کے اسلامی عہد کا ترجمہ کرا کے اپنی علم نوازی کا ثبوت دیا۔ پھر کلکتہ سے دیسی زبانوں کی طباعت کے لئے ٹائپ بنوائے اور بہترین کتابیں چھپوائیں۔ کچھ کتابیں مفت تقسیم کرائیں۔ قابل معلمین کی فراہمی اپنے ذمہ لی۔ چنانچہ صوبہ بمبئی کے تمام کلکٹر اپنے اضلاع کے لئے معلم سوسائٹی ہی کے وسیلے سے حاصل کیا کرتے تھے۔ فوجی اسکولوں کے لئے اعلیٰ معلم بھی سوسائٹی ہی نے مہیا کئے ہیں۔ اس زمانے میں کمانڈران چیف کے حکم سے ہر ہندوستانی پلٹن سے دو عہدیدار فن تعلیم سیکھنے بمبئی بھیجے جاتے تھے

اس موقع پر یہ بحث دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ صوبۂ بمبئی میں ملکی باشندوں کو انگریزی زبان میں کیوں تعلیم دلائی گئی۔ دراصل انگریزی زبان کو ذریعہ تعلیم بنانیکا مسئلہ ۱۷۹۲ء میں پیدا ہوا تھا۔ سر چارلس گرانٹ پہلے انگریز تھے جنہوں نے یہ مسئلہ انگلستان میں بڑے زور و شور سے اٹھایا تھا۔ بنگال میں ۱۸۲۳ء میں رام موہن رائے بھی اسی کی تائید کرتے رہے کہ ہندوستان کے باشندوں کو انگریزی

زبان ہی میں جملہ علوم وفنون سکھائے جائیں۔ مگر مقامی حکومتیں یہ چاہتی تھیں کہ دیسی
زبانوں کو ترقی دیکر تعلیم میں اصلاح کیجائے۔ ۱۸۱۷ء میں کلکتہ اسکول بُک سوسائٹی بھی
اسی مقصد کے لئے عالم وجود میں آئی تھی اور ۱۸۱۹ء میں اسکول سوسائٹی کی بنیاد بھی اسی
غرض سے پڑی تھی ایم الفنسٹن صاحب گورنر بمبئی نے اپنی یادداشت بابت ۱۸۲۴ء میں رقم
فرمایا ہے کہ میں تو یہی خیال کرتا ہوں کہ اہل ہند کے دماغ اسیوقت اعلیٰ قابلیت و ذکاوت سے
ثمریاب ہونگے۔ جب مشرقی علوم کی شاخ پر خالص ہندوستانی سیرت کا پیوند لگایا جائیگا" الفنسٹن صاحب
کے بعد سرجان میلکم صاحب بمبئی کے گورنر مقرر ہوئے۔ اس مسئلہ میں وہ بھی اپنے پیش رو کے
ہم خیال تھے مگر بمبئی کی طرح ہندوستان کے دوسرے حصوں میں بھی ایک جماعت ایسے افراد کی پیدا
ہوگئی تھی جو اہل ہند کو خالص انگریزی تعلیم دلانے کی موید تھی۔ رفتہ رفتہ اس جماعت کے
افراد کی تعداد بڑھتی گئی بمبئی نیٹیو ایجوکیشن سوسائٹی کے اراکین پندرہ سال تک اسی کشمکش میں
مبتلا رہی۔ اس زمانہ میں بمبئی میں الفنسٹن کالج قائم ہوچکا تھا جس سے انگریزی تعلیم کو فروغ
حاصل ہوگیا تھا۔ اب اہل بمبئی کے دل و دماغ مغربی تہذیب سے آشنا ہونے لگے تھے اور وہ
اپنی اولاد کو خالص انگریزی تعلیم دلانا چاہتے تھے۔ مگر باینہمہ بمبئی ایجوکیشن سوسائٹی کے سرگرم
اراکین جنمیں کپتان جرس جگناتھ سنکر سیٹھ فرام جی کاؤسجی اور محمد بن بکیع شامل تھے سختی سے
اس امر کا مطالبہ کرتے رہے کہ "اہل بمبئی کو انکی مادری زبانوں میں تعلیم دیجائے۔ اگر دیسی زبانوں میں مغربی اعلیٰ
علوم ابھی نہ سکھائے جاسکیں تو سردست انگریزی ہی میں سکھائے جائیں۔ مگر رفتہ رفتہ وہ علوم
دیسی زبانوں میں منتقل کردئے جائیں" میں اس سلسلہ میں آپ کی توجہ سوسائٹی کی رپورٹ بابت سال
۱۸۲۵-۲۶ء کی اس عبارت پر مبذول کرانا چاہتا ہوں جو غور طلب ہے۔ "ملکی زبانوں کو ذریعہ تعلیم بنانے ہی
سے ہندوستانی دل و دماغ میں اخلاقی و ذہنی ارتقا رونما ہوسکتا ہے۔ ابتک ہم دیکھ رہے ہیں کہ

اہل ہند انگریزی پڑھ پڑھکر اپنی مادری زبانوں سے غفلت اختیار کرتے جاتے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ آگے چلکر یہ آپسمیں اپنی زبانمیں اپنا مفہوم سمجھا بھی نہ سکیں" مگر عام انگریزوں کا یہ خیال نہ تھا یہ مضمون خلاف امید بہت طویل ہوگیا مجبوراً دیگر مسائل کو نظر انداز کرکے ۱۸۲۵ء لغایت ۱۸۳۰ء کا تعلیمی خاکہ پیش کرتا ہوں جس سے ظاہر ہوگا کہ اس زمانے میں صوبہ بمبئی میں اسکولوں کی تعداد کیا تھی، وہ کہاں کہاں تھے اور انمیں کتنے طلبا موجود تھے۔ ۱۸۲۵ء

نام اسکول	تعداد اسکول	مقام	تعداد طلبا	کیفیت	نام اسکول	تعداد اسکول	مقام	تعداد طلبا	کیفیت
سنٹرل انگلش اسکول	۳	بمبئی	۴۶	۰	ورناکیولر اسکول	۱	جنوبی کونکن	۳۵	
مرہٹی اسکول	۱	″	۵۲	۰	″	۲۳	مضافات		
گجراتی اسکول	۱	″	۶۱	۰	مرہٹی ″	۴	بمبئی	۱۴۱	
ورناکیولر اسکول	۱	تھانہ	۳۰	۰	گجراتی ″	۴	″		
″	۱	پریل	۳۰	۰					

صوبہ بمبئی میں ۱۸۳۰ء میں جملہ مدارس کی تعداد ۵۶ تھی جنمیں ۳۵۰۰ طلبا زیر تعلیم تھے۔ ۱۸۳۲ء میں مضافات کے اسکول پونہ اور سورت کے کلکٹروں کے سپرد کردئے گئے کلکٹروں کے حکم سے ان اسکولوں کی نگرانی کے لئے دو چیف انسپکٹر مدارس مقرر ہوئے۔ اس زمانہ کے بعد سے بمبئی نیٹیو ایجوکیشن سوسائٹی کا تعلق صرف بلدیہ بمبئی کے انگریزی اور ورناکیولر اسکولوں سے باقی رہگیا۔ اور صوبہ کے باقیماندہ مدارس براہ راست حکومت کے قبضے میں آگئے۔ ۱۸۴۰ء سے حکومت نے تعلیمی امور کا تعلق اور جملہ مدارس کا نظم و نسق بورڈ آف ایجوکیشن کے ذمہ کردیا۔

اس بورڈ کے صدر سکریٹری اور تین ممبر حکومت بمبئی نامزد کرتی تھی اور تین ممبر ایجوکیشن سوسائٹی کی طرف سے شامل ہوتے تھے نیٹیو ایجوکیشن سوسائٹی کا تمام سرمایہ بھی اس بورڈ کے حوالہ کردیا گیا۔

غرض جس طرح ۱۸۵۸ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی حکومت برطانیہ کو ہندوستان کی

امانت سونپ کر سبکدوش ہوگئی۔ اسی طرح سنہ ۱۸۴ء سے بمبئی نیٹیو ایجوکیشن سوسائٹی کو اپنا وہ گلشن تعلیم باضابطہ حکومت بمبئی کے حوالے کرنا پڑا جسکی نخل بندی اس نے کمال عرق ریزی و جانفشانی سے کی تھی اور جسے برسوں اپنے خون دل سے سینچا تھا۔

غرض مشرقی علوم و فنون کی اس محفل کو جو سلطنت مغلیہ کی تباہی کے بعد سونی ہو چکی تھی مغربی قوموں نے یہاں آکر پھر آراستہ کیا۔ پادریوں نے عیسوی مذہب کے گلدانوں میں انگریزی علم کے گلدستے سجائے۔ کمپنی کے اعلےٰ افسر صدر محفل بنے انہوں نے تہذیب و تمدن کی پرانی بساط الٹکر اہل محفل کو نئے آداب سکھائے اور وہ نرالی دھج دکھائی کہ رفتہ رفتہ سب کے دلوں کو وہی لبھانے لگی۔ جگہ جگہ مغربی حکمت کے قمقمے اپنی آب و تاب دکھانے لگے۔ مشرقی علم کا دیا ٹمٹمانے لگا۔

صوبۂ بمبئی میں بمبئی ایجوکیشن سوسائٹی مختلف صورتوں میں ۲۵ سال تک مغربی علوم کی مشعل بردار رہی ہے۔ اسی نے یہاں سنہ ۱۸۱۵ء سے سنہ ۱۸۴ء تک خیابان علم و فضل کی آبیاری کی ہے۔ جس سے مرہٹی اور گجراتی زبانوں کے گلشن مرجھانے نہ پائے۔ انگلستان ایران اور عرب کی زبانوں کے پودے لگا لگا کر ان میں وسعت اور شان دل ربائی پیدا کی جو گلکاریاں ان میں آج نظر آرہی ہیں وہ اس سوسائٹی ہی کی شرمندۂ احسان ہیں ÷

محمود۔ اسرائیلی

مطبوعہ

المصطفویہ پریس بھنڈی بازار

بمبئی ۳